

ملتِ اسلامیہ کا علمی اور اصلاحی مجلہ

مَحَلِّت

ستمبر ۲۰۰۱ء

252

✽ انسان کی طبعی کمزوریاں، قرآن کریم کی روشنی میں!

✽ تفسیر ابن کثیر، منہج اور خصوصیات

✽ مالی بدعنوانیوں کا انسداد، سیرتِ طیبہ کی روشنی میں



مجلس التحقیق الاسلامی

ملت اسلامیہ کا علمی و اصلاحی مجلہ

مُحَدِّث

لاہور

ماہنامہ

حافظ حسن مدنی

حافظ عبدالرحمن مدنی

مدیر اعلیٰ

فہرست مضامین

صفحہ

فکر و نظر

ترقی پسند اسلام یا اسلام پسند ترقی !!؟ محمد عطاء اللہ صدیقی ۲

کتاب و حکمت

تفسیر سورة الکافرون تفسیر ابن کثیر..... منہج اور خصوصیات مولانا عبدالغفار حسن ۶
ڈاکٹر محمد اکبر ربانی ۹

دارالافتاء

محافل قراءت میں اللہ اللہ کہنا، نابالغ کی امامت حافظ ثناء اللہ مدنی ۲۹

مقالات

مالی بدعنوانیوں کا انسداد، سیرت طیبہ کی روشنی میں! ڈاکٹر حافظ محمود اختر ۳۱
اندر حسین عزمی ر عبد اللہ معتاز ۳۳ انسان کی طبعی کمزوریاں، قرآن کریم میں!

اخبار الجامعة

مرزا عمران حیدر ۴۰ 'جامعہ لاہور الاسلامیہ' کی تعلیمی سرگرمیاں
عبد الشکور ظہیر ۴۲ ☆ 'رابطہ عالم اسلامی' کی دو قراردادیںجلد ۳۳ / شماره ۹
جمادی الثانیة ۱۴۲۲ھ
ستمبر ۲۰۰۱ءزر سالانہ ۲۰۰/روپے
فی شمارہ ۲۰/روپے

مدیر اعلیٰ

زر سالانہ ۲۰/روپے
فی شمارہ ۲/روپےMonthly MUHADDIS A/c No: 984
UBL - Model Town Crossing, Lahore

دفتر کا پتہ

۹۹ جے، ماڈل ٹاؤن

لاہور 54700

Ph: 5866476, 5866396, 5839400
Email: hhasan@wol.net.pk

مدرسہ کتب خانہ کی روشنی میں اسلام اور مجتہدین کا حالیہ دور کا جائزہ لیتے ہوئے کئی اہم موضوعات پر روشنی ڈالنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

Publisher: Hafiz Abdul Rahman Madani
Printer: Shirkat Printing Press, Lahore

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فکرو نظر

ترقی پسند اسلام یا اسلام پسند ترقی؟

تعلیم کا معاملہ ہو یا صحت عامہ کی بات، سائنسی ترقی کا سوال ہو یا معاشی خوشحالی کی بات ہو، پسمنانگی اور بدحالی ہر جگہ ہمارے سامنے آتی ہے۔ دنیا بھر میں ہمارا تعارف ایک پسمنانہ قوم کے طور پر موجود ہے۔ البتہ ایک شعبہ ایسا ہے جس میں ہم نے ’ہوش ربا‘ ترقی کی ہے، وہ ہے ’ترقی پسندی‘۔ ہمارا طرہ امتیاز یہ ہے کہ ہم ترقی کرنے کی بجائے ’ترقی پسندی‘ کو زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہمارے لئے یہی امر ہی راحت القلوب ہے کہ ہم ترقی پسند ہیں۔ ہم ترقی یافتہ ممالک کے دانشوروں کو بڑے فخر سے بتا سکتے ہیں کہ ترقی کے معاملے میں ہم ان سے بہت پیچھے تھے، مگر ’ترقی پسندی‘ میں ہم دنیا کی کسی بھی قوم کے کندھے سے کندھا ملا کر چل سکتے ہیں۔ ہمارے روشن خیال دانشور پوری قوم کے ’شکریہ‘ کے مستحق ہیں، کہ بالآخر انہوں نے اپنی شبانہ روز ابلاغی کاوشوں اور فکری محنتوں سے اس قوم کے اندر ’ترقی پسندانہ‘ جذبات کو ’فروغ‘ دے کر اسے احساس کمتری کی ’ذلت آمیز‘ منزل سے باہر نکالا ہے۔

۱۹۳۰ء کے عشرے میں برصغیر پاک و ہند میں مارکسی نظریات کی یلغار کے نتیجے میں ادیبوں کا ایک گروہ وجود میں آیا جس نے روایت شکنی کو اپنا دین و ایمان سمجھ لیا۔ الحاد پرست ادیبوں کے اس طائفہ نے جس تحریک کی بنیاد رکھی، وہ ’ترقی پسند تحریک‘ کہلائی اور یہ خود اپنے آپ کو ’ترقی پسند‘ کہلانے لگے۔ مذہبی طبقہ ان کی جارحانہ تنقید اور استہزاء کا تحقّہ مشق بن گیا۔ مذہبی طبقہ سے ان کی منافرت بالآخر مذہب سے متعلق ہر فکر و عمل تک پھیل گئی۔ مذہب سے وابستہ ہر بات ان کے نزدیک ’رجعت پسندی‘ کہلائی۔ مارکسی فکر والے ان دانشوروں کی زبانیں انگارے برساتی تھیں، غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کی طرف سے جو ترقی پسند ادیبوں کے افسانوں کا پہلا مجموعہ شائع ہوا، اس کا نام ’انگارے‘ تھا۔ ان ’انگاروں‘ کی تپش نے دین و ایمان، شرم و حیا اور روحانی اقدار کے گلستان کو کافی متاثر کیا۔ مذہب بیزاری اور الحاد پرستی کے جذبات کو اس تحریک نے پروان چڑھایا۔ ۱۹۶۰ء کے عشرے میں ایوب خانی آمریت کے دوران ان اشتراکی ترقی پسندوں نے وہ رسوخ حاصل کیا کہ اچھے خاصے دین دار ادیب اپنی دینداری کو چھپاتے پھر رہے تھے کہ کہیں ان پر رجعت پسندی کا ٹھپہ نہ لگ جائے۔

۱۹۸۰ء کی دہائی کے آخر میں سوویت یونین کے انہدام کے نتیجے میں جب اشتراکی نظریہ عالمی منظر سے روپوش ہونے لگا، تو پاکستان میں بھی ترقی پسند ادب کی تحریک کو زوال آ گیا۔ اب کوئی ترقی پسند ادبی

تحریک تو نظر نہیں آتی، البتہ 'ترقی پسندی' کا ڈھنڈورا خوب پیٹا جا رہا ہے۔ ہر سیکولر، اشتراکی اور مذہب بیزار ترقی پسندی کے بخار میں مبتلا نظر آتا ہے۔ شکست خوردہ اشتراکیوں کے وہ نام نہاد انقلابی جتھے جو اٹھتے بیٹھتے امریکہ کو گالیاں دیتے تھے، آج انسانی حقوق کی امریکی ٹرین کی اگلی بوگی پر سوار دکھائی دیتے ہیں۔ پاکستان کے انسانی حقوق کے انتھک منادوں میں اکثریت انہی بائیں بازو کے افراد کی ہے۔ ان 'انقلابیوں' نے ایک دفعہ پھر 'ترقی پسندی' کو قبضہ قدرت میں لے لیا ہے۔ یہ مولویوں کو مذہب کا ٹھیکیدار ہونے کا طعنہ دیتے تھے، آج یہ خود 'ترقی پسندی' کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں۔ اگر کسی نے اپنے آپ کو ترقی پسند کہلوانا ہو، تو ان جعل سازوں سے اسے مہر لگوانے کو کہا جاتا ہے۔

پوری دنیا میں جو چند ایک الفاظ مجلسی زندگی میں بے حد کثرت سے استعمال ہوتے ہیں، ان میں لفظ 'ترقی' بے حد اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ جدید نظام معیشت اور ماہرین معاشیات کی اصطلاحات میں 'ترقی' کی اصطلاح اہم ترین ہے۔ مختصراً اگر یہ کہا جائے کہ آج انسانی جدوجہد کا محور و مرکز بلکہ مقصد و حید ہی 'ترقی' ہے۔ مگر اسے علمی اعتبار سے ایک المیہ کہنا چاہئے کہ اس قدر اہم اصطلاح کا نہ ابھی تک صحیح مفہوم متعین کیا جاسکا ہے، نہ ہی مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ افراد 'ترقی' کے متعلق یکساں ادراک رکھتے ہیں۔ اشتراکی فلسفہ پر جان چھڑکنے والوں سے آپ استفسار کیجئے کہ ان کے نزدیک ترقی کا مطلب کیا ہے؟ وہ تاریخ کی مادی تعبیرات کی بھول بھلیوں سے گذرتے ہوئے بالآخر 'مساوات' شکم پر ترقی کی تان توڑیں گے۔ سرمایہ دارانہ مغرب کے ماحول میں پروردہ ایک شخص زندگی کے مادی پہلو میں بہتری، معیارات زندگی اور سہولتوں میں اضافہ، اور زیادہ سے زیادہ جدید سائنسی اکتشافات اور ان کے معاشرتی استعمالات کو ہی تمام تر 'ترقی' قرار دے گا۔

آج کل انسانی حقوق اور انسانی ترقی کے مابین نئے رشتے تلاش کئے جا رہے ہیں۔ ایک انسانی حقوق کا علمبردار فرد کی آزادیوں کے پیمانے سے ترقی کا مفہوم سمجھتا ہے۔ اس کے نزدیک ترقی یافتہ سماج وہی ہے جہاں ایک فرد کو زیادہ سے زیادہ آزادی، ضمیر، آزادی اظہار اور آزادی انجمن سازی کے حقوق میسر ہیں۔ ایشیا بالخصوص مسلم ممالک میں مسلک تصوف پر یقین رکھنے والوں کے نزدیک مادی ترقی روح کی تباہی پر منتج ہوتی ہے، ان کا منہائے مقصود صرف ان کے متعین کردہ اصولوں کے مطابق روحانی ترقی ہے۔ ایک دیہات میں رہنے والا شخص ترقی کا جو مفہوم سمجھتا ہے، شہری تمدن کے مزے اڑانے والا شخص شاید ہی اس سے اتفاق کر سکے۔ صنعتی معاشرے میں ایک مزدور اور صنعت کار کے ترقی کے نصب العین میں واضح فرق ہے۔ ایک غریب آدمی گھر، گاڑی، کچھ جائیداد، اچھی خوراک، اچھے رہن سہن کو ہی ترقی کی معراج گردانتا ہے، مگر ایک دولت مند جسے یہ سب کچھ وراثت میں ملا ہے، اس کے نزدیک ان اشیاء کی ذرہ برابر قدر و منزلت نہیں ہے، اس کے ترقی کے معیارات بالکل الگ ہیں۔ جدید خواتین سے ترقی کے

مفہوم کے بارے میں بات کیجئے، ان کے نزدیک ترقی جدیدیت کو اپنانے ہی میں ہے۔ وہ 'ماڈرن' ہونے کو ہی ترقی یافتہ سمجھتی ہیں۔ آج کل کی این جی اوز کی بیگمات، پاکستان میں جن کی قیادت عاصمہ جہانگیر کر رہی ہیں، کے نزدیک مرد کی 'غلامی' سے مکمل نجات یعنی مجرد زندگی ہی ترقی کی معراج ہے۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا 'ترقی' سے مراد صرف مادی ترقی ہے جیسا کہ ترقی کا مقبول ترین یونیورسل تصور آج کل پھیلا ہوا ہے؟ اس سوال کا براہ راست تعلق ایک اور سوال سے بھی ہے یعنی انسان کا مقصد حیات کیا ہے؟ یا اس کا مقصد تخلیق کیا ہے؟ دراصل ترقی کے بارے میں تمام تصورات کی بنیاد ہی اس سوال کے جواب پر منحصر ہے۔ جدید سیکولر مغرب نے گذشتہ چار صدیوں میں جس مقصد حیات کو آگے بڑھایا ہے، اس کا دائرہ کار محض اسی دنیاوی زندگی تک محدود ہے، حیات بعد الممات کے بارے میں ان کا اعتقاد ہی ختم ہو گیا ہے، لہذا وہ اخروی زندگی کی بہتری کے متعلق سوچنے کا اپنے آپ کو مکلف ہی نہیں سمجھتے۔ حالانکہ یہ روش غیر مسلموں کی ہے کہ وہ دنیا کی زندگی کو ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ (الانعام: ۲۹)

انسان جسم اور روح کا مرکب ہے، مگر ان کی تگ و دو کا اصل محور انسان کے جسمانی تقاضوں کی تکمیل ہی ہے، روح اور روحانی معاملات کے متعلق وہ سنجیدگی سے سوچنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پورا معاشرہ اپنے فکری منہج اور عقلی خدوخال کے اعتبار سے ایک خالصتاً مادی معاشرہ ہے۔ اگرچہ وہاں اب بھی مذہب کی مسخ شدہ شکلیں موجود ہیں، لیکن وہ مادیت ہی کے تابع ہیں، یہی وجہ ہے کہ چرچ مغربی معاشرے کو اپنے اصولوں کے مطابق نہ ڈھال سکنے کے بعد اپنے آپ کو سیکولر سماج کے مطابق ڈھالنے میں مصروف نظر آتا ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہم مغربی سماج کے اس مقصد حیات کو اپنا نصب العین قرار دے سکتے ہیں؟ اگر ہم بالفرض اسے اپنا مقصود بنا لیتے ہیں تو پھر ہمارے اسلام سے تعلق کی موجودہ بنیادیں کیا قائم رہ سکیں گی؟ اور پھر ایک اہم سوال، کیا ہم مادی ترقی کے حصول کے لئے اسلام اور اسلام کے روشن اصولوں کو قربان کر سکتے ہیں؟

ہمارے آج کل کے روشن خیال دانشور اسلام کو اس وقت تک قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں جب تک کہ اس کے ساتھ 'ترقی پسند' کا لاحقہ نہ لگا ہو۔ ان کے لئے محض 'مسلمان' کہلانا کافی نہیں ہے بلکہ وہ ترقی پسند مسلمان کہلانا پسند کرتے ہیں۔ 'ترقی پسند اسلام' کی واضح تعریف کوئی بھی متعین نہیں کرتا۔ مگر سیکولر دانشوروں کی گفتار متواترہ سے ترقی پسند اسلام کا جو مفہوم سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ اس سے مراد ایسا اسلام ہے جس میں سماجی انصاف، رواداری اور روشن خیالی کی اعلیٰ اقدار کا اظہار ہوتا ہے۔ اشتراکی دانشور جس 'سماجی انصاف' کا ڈھندوڑا پیٹتے ہیں، اس کی جزئیات اور باریکیوں کو نگاہ میں رکھا جائے تو اس کا مرجع و مصدر مارکسزم ہے نہ کہ اسلام۔ اشتراکی سماجی انصاف جس معاشی مساوات کا تصور پیش کرتا ہے، اس میں نجی ملکیت کے خاتمہ کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جبکہ اسلام نجی ملکیت کے خاتمہ کا قائل نہیں ہے، البتہ اس

کے حصول کیلئے جائز ذرائع کی تلقین کرتا ہے۔ مغربی جمہوریت کے سحر میں مبتلا سیکولر دانشور اسلام اور جمہوریت کے درمیان شوریات کی قدر مشترک رکھتے ہوئے جمہوریت کو عین اسلام تصور کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں ترقی پسند اسلام صرف وہی ہے جس میں مغربی جمہوریت کی تائید کا پہلو نکلتا ہو۔ وہ حاکمیت جمہور اور حاکمیت الہیہ کے بنیادی فرق اور اس جیسے بہت سے امور کو فراموش کر دیتے ہیں، مختصر الفاظ میں ان کے نزدیک ترقی پسند اسلام بس وہی ہے جس میں اشتراکیت اور جمہوریت کے ساتھ فکری اشتراک پایا جاتا ہو۔ اگر کوئی بات اسلام میں تو ہے مگر اشتراکیت یا مغربی جمہوریت سے متصادم ہے تو پھر ایسا 'اسلام' انہیں قبول نہیں ہے۔ قرآن مجید میں جنت اور جہنم کا تفصیل کے ساتھ ذکر موجود ہے، مگر ہمارے 'ترقی پسند' مسلمان جہنم، یا عذابِ قبر کا ذکر سننے کو قطعاً تیار نہیں ہیں۔ ان کے خیال میں مولوی جہنم کا ذکر کر کے لوگوں کو ڈرانا چاہتے ہیں تاکہ وہ خوف کے مارے ان کی مالی معاونت کریں۔ 'ترقی پسند اسلام' میں صرف معاملات کے ذکر پر اکتفا کیا جاتا ہے، عبادت کی تکرار ان کے خیال میں رجعت پسندی ہے۔ آج کل ترقی پسندوں نے 'انسان دوستی' کا بہت واویلا مچا رکھا ہے۔ انسان دوستی کا فلسفہ درحقیقت انسان پرستی کا دوسرا نام ہے۔ مغرب میں اس نظریہ کو خدا بیزار فلسفیوں نے متعارف کرایا۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو خدا کا ذکر چھوڑ کر اپنی سرگرمیوں کا محور و مرکز بس 'انسان' کو ہی سمجھنا چاہئے۔ ہیومن ازم درحقیقت ایک ملحدانہ نظریہ ہے مگر ہمارے ترقی پسند اسے ہی سب کچھ سمجھتے ہیں۔ اسلام میں 'جہاد' کو بھی بے حد اہمیت حاصل ہے، مگر ترقی پسند مسلمان جہاد کو 'بنیاد پرستی' کا مظہر سمجھتے ہیں۔ اسلام میں گستاخِ رسول کی سزا موت ہے مگر 'ترقی پسند اسلام' کے پجاری قانون تو ہیں رسالت کو انسانی حقوق کے منافی سمجھتے ہیں۔ اسلام عورتوں کو گھر بیٹھنے اور حجاب اپنانے کی ہدایت کرتا ہے مگر 'ترقی پسند مسلمانوں' کی ترقی پسندی کا اصلی نصب العین ہی یہ ہے کہ عورتوں کو زندگی کے ہر میدان میں مردوں کے شانہ بشانہ لایا جائے۔ اسلام سود خوری کو اللہ سے جنگ قرار دیتا ہے مگر 'ترقی پسند مسلمان' سود کے بغیر امور ریاست کی انجام دہی کو ناقابلِ عمل سمجھتے ہیں۔ اسلام موسیقی، رقص و سرور، بت گری اور مخلوط مجالس سے منع کرتا ہے۔ مگر ترقی پسند مسلمان اسے فنونِ لطیفہ اور آرٹ کا درجہ دیتے ہیں۔ یہ فرق ہمیں چند امور میں نہیں بلکہ تمام بنیادی امور میں دکھائی دیتا ہے۔ عام مسلمانوں کے 'اسلام' اور ترقی پسندوں کے 'اسلام' میں ہر اعتبار سے فرق ہے۔

ہمارا حکمران طبقہ اور سیکولر دانشور ترقی پسند اسلام کی بات کرتے ہیں، جبکہ انہیں چاہئے کہ وہ 'اسلام پسند ترقی' کے تصور کو آگے بڑھائیں یعنی وہ ترقی ایسی ہو جس میں اسلام سے بھی ہمیں ہاتھ نہ دھونے پڑیں اور اسلامی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہم اس کو حاصل کر سکیں۔ وہ ترقی ایسی ہو جس میں دنیا کے ساتھ ساتھ دین کی پاسداری کی ضمانت بھی دی جاسکتی ہو۔ روحانی اور اخلاقی زوال سے دوچار کرنے والی تحریک 'ترقی پسندانہ' ہو تو ہو، اسے 'اسلامی' نہیں کہا جاسکتا۔ ☆ (محمد عطاء اللہ صدیقی)

افادات: علامہ ابن قیم جوزی
تحریر: مولانا عبدالغفار حسن

تفسیر سورۃ الکافرون

س ۱: ﴿لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ﴾ یہاں بجائے مَنْ کے جو عقلاء کے لئے بولا جاتا ہے، مَا کیوں استعمال کیا گیا ہے جو کہ دراصل غیر عقلاء پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر کیسے درست ہوا؟

جواب: یہاں ایسے معبود کا ذکر مقصود ہے جو صحیح معنی میں عبادت کے لائق ہو۔ مَا کے ذکر سے اسی صفت کی طرف اشارہ ہے۔ مَنْ کے بیان سے یہ مقصود حاصل نہ ہو سکتا، اس سے مراد صرف ذات ہوتی ہے یعنی ایسی ذات جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور مَا کی صورت میں معنی یہ ہوں گے کہ میں اس کی عبادت کرتا ہوں جو کہ عبادت کا اہل اور مستحق ہے۔ اس طرح سے باری تعالیٰ کی عبادت کرنے کی وجہ بھی معلوم ہوتی ہے۔ یہی معنی ہیں محققین نحویوں کے اس قول کے کہ 'مَا' کا ذکر صفات کے اظہار کے لئے ہوتا ہے۔ اس کی نظیر یہ آیت ہے ﴿فَانْكُحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِنَ النِّسَاءِ﴾ ”نکاح کرو جو تم کو بھلی لگیں عورتوں میں سے“۔ یہاں اصل مقصود صفت ہے، اسی بنا پر مَا ذکر کیا گیا ہے۔

س ۲: اس سورۃ میں ایک ہی مفہوم کو بار بار کیوں دہرایا گیا ہے؟

جواب: ﴿لَا أَعْبُدُ مَا تَعْبُدُونَ﴾ میں عبادت نہیں کرتا جس کی تم عبادت کرتے ہو۔ یعنی نہ تو اب میں زمانہ حال میں تمہارے معبودوں کی عبادت کرتا ہوں، نہ آئندہ کروں گا اور اس کے مقابلہ میں ہے: ﴿وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ﴾ اور نہ میں عبادت کرنے والا ہوں جس کی تم نے عبادت کی یعنی وحی الہی آنے سے پہلے میں شرک سے بچا ہوا تھا۔ ماضی کا صیغہ لا کر اسی مفہوم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ گویا آیت کے معنی یہ ہوئے لم أعبد قط ما عبدتم ”میں نے کبھی بھی ان کی عبادت نہیں کی جن کی تم کرتے ہو“ اور یہ معنی اس کے مقابل آیت ﴿وَلَا أَنْتُمْ عَابِدُونَ مَا أَعْبُدُ﴾ کے ہیں یعنی جس کی میں ہمیشہ عبادت کرتا رہا ہوں، اس کی تم نے گذشتہ زمانہ میں بھی عبادت نہیں کی۔ اس تفسیر کی بنا پر تکرار افعال کا اعتراض اٹھ گیا اور سورت نفی کے تمام زمانوں (ماضی اور حال و مستقبل) کو شامل ہو گئی۔

س ۳: اس میں کیا حکمت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے لئے تو اَعْبُد (مضارع کا صیغہ) استعمال کیا گیا ہے اور کفار کے ذکر میں ماضی، مضارع دونوں قسم کے صیغے موجود ہیں؟

جواب: اس اندازِ بیان سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نبی ﷺ کا معبود ہر زمانہ میں ایک ہی ہے۔ سیدھی راہ سے نہ پہلے کبھی کبھی رٹ پڑھا پڑا ہوا ہے اور نہ کبھی آئندہ ہو سکتا ہے بخلاف مشرکین کے کہ وہ دراصل اپنی خواہشات اور جذبات کی پیروی کرتے ہیں۔ آج ایک معبود کی عبادت کی توکل دوسرے کے سامنے سر جھکا دیا۔ ہر زمانہ میں ایک نیا معبود تراش لیتے ہیں۔ اس لئے تَعْبُدُونَ اور عَبَدْتُمْ ماضی، مضارع دونوں کو بیان کر دیا۔

س ۴: مشرکین کے بیان میں عَابِدُونَ اسم فاعل کا صیغہ دونوں بار لایا گیا ہے اور نبی ﷺ کے ذکر میں ایک مرتبہ مضارع اَعْبُدْ اور دوسری آیت میں اسم فاعل عَابِدٌ بیان ہوا ہے۔ اس کی حکمت کیا ہے؟

جواب: اس سورت کا مقصود یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ مشرکین کے معبودانِ باطل سے قطعی براءت اور بیزاری ظاہر کر دیں۔ لَا اَعْبُدُ کے معنی ہیں کہ میں ہر وقت ہر طرح سے اس عبادت سے بیزار ہوں۔ وَلَا اَنَا عَابِدٌ کے معنی ہیں کہ غیر اللہ کی عبادت کے وصف سے میں یکسر خالی اور بری ہوں۔ نہ عارضی طور پر میں شرک کر سکتا ہوں نہ دائمی طور پر۔ وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُونَ کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کا وصف دائمی طور پر ان میں نہیں پایا جاسکتا۔ کبھی وہ خدا کی طرف جھک جاتے ہیں اور کبھی اپنے خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرنے لگتے ہیں۔ یہ دوام و استقلال تو اسی کو حاصل ہو سکتا ہے جو صرف ایک خدا کا عبادت گزار بنا رہے، اسی لئے وَلَا اَنْتُمْ تَعْبُدُونَ نہیں کہا گیا۔ خدا کی عبادت تو وہ بھی کرتے ہیں مگر شرک کی آلائشوں کے ساتھ۔ مطلقاً عبادتِ الہی کی ان سے نفی نہیں کی گئی بلکہ ان کی صفتِ عابدیت کا انکار کیا گیا ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے جو خدا کے ساتھ عبادت میں دوسروں کو شریک کرتا ہے، وہ خدا کا عابد کہلا ہی نہیں سکتا۔ اس نکتہ کو سمجھ لینے کے بعد عبد کا مقام پوری طرح ظاہر ہو گیا۔ عبد یا عابد وہ ہو سکتا ہے جو بالکلیہ تمام معبودانِ باطل سے کٹ کر یکسوئی کے ساتھ خدا کے دامن سے وابستہ ہو جائے، اس تفسیر کے بیان سے اس امر کی وجہ بھی ظاہر ہو گئی کہ اس سورۃ کا نام 'اخلاص' بھی کیوں ہے اور یہ چوتھائی قرآن کے ہم پلہ کیسے ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں توحید کا مغز بھرا ہوا ہے۔

س ۵: یہاں نفی کے واسطے لَنْ کے بجائے لَا کیوں لایا گیا ہے، حالانکہ لَنْ میں بظاہر تاکید زیادہ پائی جاتی ہے

جواب: لَنْ میں صرف زمانہ مستقبل کی نفی ہوتی ہے اور لَا کی نفی پوری طرح حال اور مستقبل میں جاری

ہوتی ہے لہذا یہاں لا کا ہی ذکر مناسب ہے۔ لَنْ اور لَا میں فرق کی ظاہر وجہ یہ ہے کہ لا کے آخر میں الف ہے جو کہ وسعت اور پھیلاؤ کے ساتھ اپنے مخرج سے نکلتا ہے، اس لئے اس کے معنی میں بھی وسعت ہی مراد ہوگی۔ لیکن لَنْ کے آخر میں 'ن' ہے جس کے مخرج میں امتداد اور پھیلاؤ نہیں ہے۔ اس لئے اس کے معنی بھی محدود ہیں۔

ان کا واضح فرق حسب ذیل آیتوں سے بخوبی ہو سکتا ہے: لَنْ تَرَانِيْ تَوْجِھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا یہاں رُؤیتِ الہی کی نفی ہمیشہ کے لئے نہیں بلکہ ایک وقتی نفی اور انکار مراد ہے جبکہ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ نِگاہیں ذات باری کا ادراک نہیں کر سکتیں سے دائمی نفی مراد ہے، اسی لئے لا بیان کیا گیا۔ لَنْ يَّتَمَنَّوْاْ اَبَدًا (سورۃ بقرہ) لَا يَّتَمَنَّوْاْ اَبَدًا (سورۃ جمعہ) ان دونوں آیتوں میں اندازِ بیان کے فرق کا راز بھی مذکورہ بالا قاعدہ کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے۔ (بدائع: ۱/۹۶)

س ۶: اس سورت میں نفی محض ہے، حالانکہ توحید کے دو پہلو ہیں نفی اور اثبات.....؟

جواب: اس سورۃ میں غیر اللہ کی عبادت کی نفی اور شرک سے بار بار بُرأت کی گئی ہے۔ یہ اس سورۃ کی خاص خوبی اور اہم مقصد ہے، اسی لئے موحدین اور مشرکین دونوں گروہوں کے بیان میں لائے نفی ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس نفی کے ساتھ اثبات بھی ہے لَا اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں عبادتِ غیر سے صرف انکار و بُرأت ہے۔ وَلَا اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَا اَعْبُدُ میں اس بات کا اعلان ہے کہ میرا ایک معبود ہے جس کی میں عبادت کرتا ہوں اور تم اس سے الگ ہو۔ پس نفی و اثبات اس سورت میں یکجا ہو گئے۔

امام حنفاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اعلان بھی اسی کے ہم معنی ہے: ﴿اَنْنِيْ بَرَاءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِيْ فَطَرْنِيْ﴾ ”بے شک میں ان سے بری اور بیزار ہوں جن کی تم عبادت کرتے ہو مگر وہ جس نے مجھ کو پیدا کیا“۔ اور یہی مطلب ہے گروہِ موحدین اصحاب الکہف کے اس قول کا ﴿وَ اِذْ اَعْتَرَلْتُمُوْهُمْ وَمَا يَّعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ﴾ ”اور جبکہ تم ان (مشرکین) سے الگ ہو گئے اور جن کی وہ عبادت کرتے تھے مگر اللہ سے“۔ غور کریں تو واضح ہو جائے گا کہ اس سورۃ الکافرون میں بھی لا الہ الا اللہ کی حقیقت پوری طرح جلوہ گر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ صبح اور مغرب کی سنتوں میں سورۃ الاخلاص اور اس سورت کو پڑھا کرتے تھے۔ یہ دونوں سورتیں توحید کی دو قسموں کو شامل ہیں جن کے بغیر بندے کی نجات و فلاح ناممکن ہے۔ ☆☆

جن حضرات کا زرسالانہ ختم ہو چکا ہو، وہ پہلی فرصت میں اس کی تجدید کرائیں۔
اس کے بغیر ہر ماہ ’محدث‘ وصول کرنا مالی خیانت کے مترادف ہے۔ ادارہ

تفسیر ابن کثیر منہج اور خصوصیات

عماد الدین ابوفدا اسمعیل بن عمر بن کثیرؒ ۷۰۱ھ میں شام کے شہر بصریٰ کے مضافات میں 'مجل' نامی بستی میں پیدا ہوئے^(۲) اور دمشق میں تعلیم و تربیت پائی۔ آپ نے اپنے عہد کے ممتاز علماء سے استفادہ کیا اور تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، تاریخ، علم الرجال اور نحو و لغت عربی میں مہارت حاصل کی^(۳)۔ آپ نے ۷۷۴ھ میں دمشق میں وفات پائی اور مقبرہ صوفیہ میں مدفون ہوئے۔^(۴)

امام ابن کثیر بحیثیت مفسر، محدث، مؤرخ اور نقاد ایک مسلمہ حیثیت کے حامل ہیں۔ آپ نے علوم شرعیہ میں متعدد بلند پایہ کتب تحریر کیں۔ تفسیر القرآن العظیم اور ضخیم تاریخ البدایہ والنہایہ آپ کی معروف تصانیف ہیں جن کی بدولت آپ کو شہرت دوام حاصل ہوئی۔ زیر نظر مضمون اول الذکر کتاب کے تذکرہ پر مشتمل ہے۔

تعارف تفسیر

علامہ ابن کثیرؒ نے قرآن کی جو تفسیر لکھی وہ عموماً تفسیر ابن کثیر کے نام سے معروف ہے اور قرآن کریم کی تفاسیر ماثورہ میں بہت شہرت رکھتی ہے۔ اس میں مؤلف نے مفسرین سلف کے تفسیری اقوال کو یکجا کرنے کا اہتمام کیا ہے اور آیات کی تفسیر احادیث مرفوعہ اور اقوال و آثار کی روشنی میں کی ہے۔ تفسیر ابن جریر کے بعد اس تفسیر کو سب سے زیادہ معتبر خیال کیا جاتا ہے۔ اس کا قلمی نسخہ کتب خانہ خدیوہ مصر میں موجود ہے۔ یہ تفسیر دس جلدوں میں تھی۔ ۱۳۰۰ھ میں یہ پہلی مرتبہ نواب صدیق حسن خان کی تفسیر فتح البیان کے حاشیہ پر بولاق، مصر سے شائع ہوئی۔ ۱۳۴۳ھ میں تفسیر بغوی کے ہمراہ نو جلدوں میں مطابع المنار، مصر سے شائع ہوئی۔ پھر ۱۳۸۴ھ میں اس کو تفسیر بغوی سے الگ کر کے بڑے سائز کی چار جلدوں میں مطبع المنار، مصر سے شائع کیا گیا۔ بعد ازاں یہ کتاب متعدد بار شائع ہوئی ہے۔ احمد محمد شاہ نے اس کو بحذف اسانید شائع کیا ہے۔ محققین نے اس پر تعلیقات اور حاشے تحریر کئے ہیں جن میں سید رشید رضا کا تحقیقی حاشیہ مشہور ہے۔ علامہ احمد محمد شاہ (م ۱۹۵۸ء) نے عمدۃ التفسیر عن الحافظ ابن کثیر کے نام سے اس کی تلخیص کی ہے۔ اس میں آپ نے عمدہ علمی فوائد جمع کئے ہیں، لیکن یہ نامکمل ہے۔ اس

☆ لیکچر شعبہ اسلامیات، گورنمنٹ ای کالج، بہاولپور

کی پانچ جلدیں طبع ہو چکی ہیں اور اختتام سورۃ الانفال کی آٹھویں آیت پر ہوتا ہے۔
محمد علی صابونی نے تفسیر ابن کثیر کو تین جلدوں میں مختصر کیا اور 'مختصر تفسیر ابن کثیر' کے نام سے اسے ۱۳۹۳ھ میں مطبع دار القرآن الکریم، بیروت سے شائع کیا۔ بعد ازاں محمد نسیب رفاعی نے اس کو چار جلدوں میں مختصر کیا اور اسے تیسیر العلی القدیر لاختصار تفسیر ابن کثیر کے نام سے موسوم کیا۔ یہ ۱۳۹۲ھ میں پہلی مرتبہ بیروت سے شائع ہوئی۔

مصادر و مآخذ

علامہ ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر کی ترتیب و تشکیل میں سینکڑوں کتب سے استفادہ کیا اور بے شمار علما کے اقوال و آراء کو اپنی تصنیف کی زینت بنایا ہے۔ چند اہم مآخذ کے نام یہ ہیں:

تفاسیر قرآن: طبری، قرطبی، رازی، ابن عطیہ، ابوسلمہ الاصفہانی، واحدی، زنجشیری، وکیع بن جراح، سدی، ابن ابی حاتم، سید بن داود، عبد بن حمید، ابن مردویہ وغیرہ

علوم قرآن: فضائل القرآن از ابو عبید القاسم، مقدمہ فی اصول تفسیر ابن تیمیہ وغیرہ۔

کتب حدیث: صحاح ستہ، صحیح ابن حبان، صحیح ابن خزیمہ، موطأ امام مالک، مستدرک حاکم، سنن دارقطنی، مسند شافعی، مسند دارمی، مسند ابویعلیٰ موصلی، مسند عبد بن حمید، مسند ابوبکر بزار، معجم کبیر طبرانی وغیرہ۔

کتب تراجم اور جرح و تعدیل: التاریخ الکبیر از امام بخاری، مشکل الحدیث از ابو جعفر طحاوی، الجرح و التعدیل از ابن ابی حاتم، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب از ابن عبد البر، الموضوعات از ابن جوزی وغیرہ۔

کتب سیرت و تاریخ: سیرت ابن اسحاق، سیرت ابن ہشام، مغازی سعید بن یحییٰ اموی، مغازی واقدی، دلائل نبوة از بیہقی، الروض الانف از سیہلی، التنویر فی مولد السراج المنیر از عمر بن دحیہ کلبی، تاریخ ابن عساکر وغیرہ۔

فقہ و علم کلام: کتب الام از امام شافعی، الارشاد فی الکلام از امام الحرمین، کتب الاموال ابو عبید القاسم، الاشراف علی مذاہب الاشراف از ابن ہبیرہ وغیرہ۔

لغات: الصحاح از ابو نصر جوہری، معانی القرآن از ابن زیاد الفراء وغیرہ۔

ان مصادر کے علاوہ فضائل شافعی از ابن ابی حاتم، کتب الآثار والصفات از بیہقی، کشف الغطاء فی تبیین الصلوۃ الوسطی از دمیاطی، کتب التفکر والاعتبار از ابن ابی الدنیا، السرا المکتوم از رازی اور دیگر متعدد کتب کے حوالے بھی ہمیں اس تفسیر میں ملتے ہیں، جن سے حافظ ابن کثیر کے وسعت مطالعہ اور تحقیقی میدان میں دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے اپنی کئی تصانیف کے حوالے بھی تفسیر میں دیئے ہیں، مثلاً البدایہ والنہایہ، کتاب السیرۃ، الاحکام الکبیر، صفۃ النار، احادیث الاصول، جزء فی ذکر تطہیر المساجد، جزء فی الصلوٰۃ الوسطی، جزء فی ذکر فضل یوم عرفہ، جزء فی حدیث الصور وغیرہ۔^(۵)

منہج: ذیل میں تفسیر ابن کثیر کے منہج کا تذکرہ بالاختصار پیش خدمت ہے:

تفسیر کے اصولوں کا التزام

علامہ ابن کثیرؒ نے زیر تبصرہ کتاب کا نہایت مفصل مقدمہ تحریر کیا ہے اور تفسیر کے درج ذیل اصول متعین کئے ہیں:

تفسیر القرآن بالسنۃ

تفسیر القرآن بالقرآن

تفسیر القرآن باقوال التابعین^(۶)

تفسیر القرآن باقوال الصحابہ

یہ مرکزی اور بنیادی اصول تفسیر ابن کثیرؒ میں یکساں طور پر بالترتیب نظر آتے ہیں۔ امام موصوف سلیس اور مختصر عبارت میں آیات کی تفسیر کرتے ہیں۔ ایک آیت کے مفہوم کو واضح کرنے کے لئے کئی قرآنی آیات یکے بعد دیگرے پیش کرتے ہیں اور اس سے متعلق جملہ معلوم احادیث ذکر کرتے ہیں، بعد ازاں صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کے اقوال و آثار درج کرتے ہیں۔ اسی انداز میں مثالیں ان کی تفسیر میں بکثرت پائی جاتی ہیں۔

سورۃ المؤمنون کی آیت: ۵۰ ﴿وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَآوَيْنَهُمَا إِلَىٰ رُبُوعٍ ذَاتِ قَرَارٍ وَمَعِينٍ﴾ کی تفسیر میں متعدد روایات و اقوال نقل کئے ہیں اور مختلف مغایم بیان کئے ہیں۔ ایک مفہوم کو ترجیح دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

”یہ مفہوم زیادہ واضح اور ظاہر ہے، اس لئے کہ دوسری آیت میں بھی اس کا تذکرہ ہے، اور قرآن کے بعض حصے دوسرے حصوں کی تفسیر کرتے ہیں اور یہی سب سے عمدہ طریقہ تفسیر ہے، اس کے بعد صحیح حدیثوں کا اور ان کے بعد آثار کا نمبر آتا ہے“^(۷)

نقد و جرح

حافظ ابن کثیرؒ ایک بلند پایہ محدث تھے، اس لئے انہوں نے محدثانہ طریق پر یہ کتاب مرتب کی ہے اور نہایت احتیاط سے صحیح حدیثوں کے انتخاب کی کوشش کی ہے۔ وہ دورانِ بحث جرح و تعدیل کے اصولوں کو بروئے کار لاتے ہوئے صحیح روایات کو نکھار کر پیش کرتے ہیں، بعض روایات کو ضعیف قرار دیتے ہیں جبکہ غلط اور فاسد روایتوں کی تردید کرتے ہیں، مثلاً آیت ﴿يَوْمَ نَطْوِي السَّمَاءَ كَطَيِّ السِّجِلِّ﴾

لِلْكِتَابِ ﴿الانبیاء: ۱۰۴﴾ کے بارے میں ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ’سجّل‘ آنحضورؐ کے ایک کاتب کا نام تھا۔ اس پر تنقید کرتے ہوئے ابن کثیر تحریر کرتے ہیں:

”یہ منکر روایت ہے اور قطعاً صحیح نہیں۔ ابن عباسؓ سے بھی جو روایت بیان کی جاتی ہے، وہ ابوداؤد میں ہونے کے باوجود غلط ہے۔ حفاظ کی ایک جماعت نے اس کی وضعیت پر ایک مستقل رسالہ تحریر کیا ہے اور ابن جریر نے بھی اس کا نہایت پر زور رد کیا ہے۔ اس روایت کے ضعیف ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے تمام کاتبین وحی نہایت مشہور لوگ ہیں اور ان کے نام معروف ہیں۔ صحابہ میں بھی کسی کا نام ’سجّل‘ نہ تھا“ (۸)

علامہ ابن کثیرؒ مختلف روایتوں کے متعدد طرق و اسناد کا ذکر کر کے رواۃ پر بھی جرح کرتے ہیں، مثلاً ”سورة البقرة کی آیت: ۱۸۵ ﴿هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَى﴾ کے تحت ابو معشر نجیح بن عبدالرحمن مدنی کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (۹) اسی طرح سورة مذکور کی آیت: ۲۵۱ ﴿وَلَوْ لَا دَفَعُ اللَّهُ النَّاسَ بَعْضُهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْأَرْضُ﴾ کی تفسیر میں مختلف طرق سے روایت ایک بیان کی ہے اور یحییٰ بن سعید کو ضعیف قرار دیا ہے۔ (۱۰) سورة نساء کی آیت: ۴۳ ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّى تَغْتَسِلُوا﴾ کی تفسیر میں سالم بن ابی حفصہ کو متروک اور ان کے شیخ عطیہ کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اسی سورت کی آیت: ۹۳ ﴿وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاءُ جَهَنَّمَ الْخ﴾ کے سلسلے میں فرماتے ہیں:

”ابن مردویہ میں حدیث ہے کہ جان بوجھ کر ایماندار کو مار ڈالنے والا کافر ہے، یہ حدیث منکر ہے اور اس کی اسناد میں بہت کلام ہے“ (۱۲)

ابن کثیر نے احادیث کے ساتھ ساتھ آثار صحابہ اور اقوال تابعین بھی کثرت سے نقل کئے ہیں، لیکن ان کی صحت جانچنے کے لئے یہاں بھی انہوں نے بحث و تنقید کا معیار برقرار رکھا ہے اور ان کی تائید یا تردید میں اپنی معتبر رائے کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً سورة نساء کی آیت: ۴۱ ﴿فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ الْخ﴾ کی تفسیر میں ابو عبد اللہ قرطبی کی کتاب ’تذکرہ‘ کے حوالے سے حضرت سعید بن مسیب کا قول نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”یہ اثر ہے اور اس کی سند میں انقطاع ہے۔ اس میں ایک راوی مبہم ہے، جس کا نام ذکر نہیں کیا گیا نیز یہ سعید بن مسیب کا قول ہے، جسے انہوں نے مرفوع بیان نہیں کیا“ (۱۳)

جرح و قدح کے ضمن میں ابن کثیرؒ تاریخی غلطیوں اور حوالوں کی بھی تردید کرتے ہیں، مثلاً ﴿وَإِذَا تَتَلَوْا عَلَيْهِمْ آيَاتِنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هَذَا الْخ﴾ (الانفال: ۳۱) کے تحت لکھتے ہیں:

”حضور ﷺ نے بدر کے روز تین قیدیوں کے قتل کا حکم دیا تھا: (۱) عقبہ بن ابی معیط (۲) طعیمہ بن عدی اور (۳) نضر بن حارث..... سعید بن جبیر نے ایک روایت میں طعیمہ کی بجائے مطعم بن عدی کا نام بتایا ہے۔ یہ بات غلط ہے، کیونکہ مطعم بن عدی تو بدر کے روز زندہ ہی نہیں تھا، اس لئے اس روز حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ اگر آج مطعم بن عدی زندہ ہوتا اور ان مقتولین میں سے کسی کا سوال کرتا تو میں اس کو وہ قیدی دے دیتا۔ آپؐ نے یہ اسلئے فرمایا تھا کہ مطعم نے آنحضرت ﷺ کو اس وقت تحفظ دیا تھا جب آپؐ طائف کے ظالموں سے پیچھا چھڑا کر مکہ واپس آ رہے تھے“ (۱۳)

شان نزول کا بیان

اگر کسی سورۃ یا آیت کا شان نزول ہے تو امام ابن کثیرؒ اپنی تفسیر میں اس کا تذکرہ کرتے ہیں، مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت: ۱۰۹ ﴿وَدَكَّثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُمْ مِنْ بَعْدِ إِيمَانِكُمْ.....﴾ الخ کے تحت لکھتے ہیں:

”ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ عرب یہودیوں میں حبی بن اخطب اور ابویاسر بن اخطب دونوں مسلمانوں کے شدید ترین حاسد تھے اور وہ لوگوں کو اسلام سے روکتے تھے۔ جہاں تک ان کا بس چلتا وہ مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے۔ ان کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی، زہری کہتے ہیں کہ کعب بن اشرف شاعر تھا اور وہ اپنی شاعری میں نبی ﷺ کی ہجو کیا کرتا تھا۔ اس کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی“ (۱۵)

سورۃ اخلاص کا شان نزول اس طرح بیان کیا ہے:

”مسند احمد میں ہے کہ مشرکین نے حضور ﷺ سے کہا کہ اپنے رب کے اوصاف بیان کرو، اس پر یہ آیت اتری، اور حافظ ابو یعلیٰ موصلی کہتے ہیں کہ ایک اعرابی نے رسول کریم ﷺ سے یہ سوال کیا تھا، اس کے جواب میں یہ سورۃ اُتری“ (۱۶)

فقہی احکام کا بیان

ابن کثیرؒ احکام پر مشتمل آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فقہی مسائل پر بحث کرتے ہیں اور اس سلسلے میں فقہاء کے اختلافی اقوال و دلائل بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً سورۃ بقرہ کی آیت ﴿قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ.....﴾ الخ کے تحت لکھتے ہیں:

”مالکیہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ نمازی حالت نماز میں اپنی نظریں اپنے سامنے رکھے نہ کہ سجدہ کی جگہ جیسا کہ شافعیؒ، احمدؒ اور ابو حنیفہؒ کا مسلک ہے۔ اس لئے کہ آیت کے لفظ یہ ہیں ﴿فَوَلَّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ﴾ ”یعنی مسجد حرام کی طرف منہ کرو اور اگر وہ سجدہ کی جگہ نظر جمانا چاہے گا تو اسے قدرے جھکنا پڑے گا اور یہ جھکنا مکمل قیام کے منافی ہوگا۔ بعض مالکیہ

کا یہ قول بھی ہے کہ قیام کی حالت میں اپنے سینے پر نظر رکھے۔ قاضی شریک کہتے ہیں کہ نمازی قیام میں سجدے کی جگہ نظر رکھے جیسے کہ جمہور علماء کا قول ہے، اس لئے کہ اس میں پورا پورا خشوع خضوع ہے۔ اس مضمون کی ایک حدیث بھی موجود ہے اور رکوع کی حالت میں اپنے قدموں کی جگہ نظر رکھے اور سجدے کے وقت ناک کی جگہ اور قعدہ کی حالت میں اپنی آغوش کی طرف،^(۱۷)

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ﴾ (البقرة: ۱۸۵) کی تفسیر میں مؤلف نے چار مسائل ذکر کر کے اس بارے میں علماء کے مختلف مسالک اور ان کے براہین و دلائل بیان کئے ہیں:^(۱۸)

سورہ نساء کی آیت ۴۳، کے تحت تیمم کے مسائل اور احکام ذکر کئے گئے ہیں۔^(۱۹)

﴿لَا يَأْخُذْكُمْ اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ..... الْخ﴾ (المائدة: ۸۹) کے تحت قصداً قسم کے سلسلے میں کفارہ ادا کرنے کے مسائل بیان کئے گئے ہیں۔^(۲۰)

امام ابن کثیر فقہی سائل میں عموماً شافعی مسلک کی تائید کرتے ہیں۔

روایات و اقوال میں تطبیق

ابن کثیر مختلف و متضاد روایات میں جمع و تطبیق کی کوشش کرتے ہیں اور ان کے مابین محاکمہ کرتے ہیں، مثلاً سورۃ آل عمران کی آیت ۱۶۹: ﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرَرِّقُونَ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

”صحیح مسلم میں ہے، مسروقؒ کہتے ہیں: ہم نے عبداللہ بن مسعود سے اس آیت کا مطلب پوچھا تو حضرت عبداللہ بن مسعودؒ نے فرمایا کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا تو آپؐ نے فرمایا: شہیدوں کی روحوں پرندوں کے قالب میں ہیں اور ان کے لئے قندیلیں ہیں جو عرش کے ساتھ لٹک رہی ہیں۔ وہ ساری جنت میں جہاں کہیں چاہیں، کھائیں، پیئیں اور ان قندیلیوں میں آرام کریں، لیکن مسند احمد میں ہے کہ شہید لوگ جنت کے دروازے پر نہر کے کنارے سبز گنبد میں ہیں، صبح و شام انہیں جنت کی نعمتیں پہنچ جاتی ہیں۔ دونوں حدیثوں میں تطبیق یہ ہے کہ بعض شہداء وہ ہیں جن کی روحوں پرندوں کے قالب میں ہیں اور بعض وہ ہیں جن کا ٹھکانہ یہ گنبد ہے، اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جنت میں سے پھرتے پھرتے یہاں جمع ہوتے ہوں اور پھر انہیں یہیں کھانے کھلائے جاتے ہوں۔ واللہ اعلم!،^(۲۱)

آپ مختلف تفسیری اقوال میں بھی تطبیق دیتے ہیں مثلاً سورۃ قصص کی آیت: ۸۵ ﴿لَرَأَىٰ ذَٰلِكَ إِلَىٰ مَعَادٍ﴾ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے تین قول نقل کئے ہیں: (۱) موت (۲) جنت اور (۳) مکہ۔ ان تینوں اقوال میں یہ تطبیق دی ہے کہ مکہ کا مطلب فتح مکہ ہے جو آنحضور ﷺ کی موت کی قربت کی دلیل ہے اور روز قیامت مراد لینے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بہر حال موت کے بعد ہی ہوگا اور

جنت اس لئے کہ تبلیغ رسالت کے صلہ میں آپ کا ٹھکانہ وہی ہوگا۔ (۲۲)

قرآنی آیات کا ربط و تعلق

ابن کثیر قرآن مجید کے ربط و نظم کا تذکرہ بھی کرتے ہیں۔ وہ اپنی تفسیر میں آیات کے باہمی تعلق اور مناسبت کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ قرآن پاک ایک مربوط و منظم کتاب نظر آتی ہے، اس سلسلے میں متعدد مثالیں تفسیر ابن کثیر میں نظر آتی ہیں، مثلاً آیت ﴿إِنَّمَا الصَّدَقَتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسْكِينِ.....﴾ (التوبہ: ۶۰) کے سلسلے میں رقم طراز ہیں:

”سورۃ توبہ کی آیت: ۸۵ ﴿وَمِنْهُمْ مَّن يَلْمِزُكَ فِي الصَّدَقَاتِ.....﴾ میں ان جاہل منافقوں کا ذکر تھا جو ذاتِ رسولؐ پر تقسیم صدقات کے سلسلے میں اعتراض کرتے تھے۔ اب یہاں اس آیت میں فرمایا کہ تقسیم زکوٰۃ پیغمبر کی مرضی پر موقوف نہیں بلکہ ہمارے بتلائے ہوئے مصارف میں ہی لگتی ہے، ہم نے خود اس کی تقسیم کر دی ہے، کسی اور کے سپرد نہیں کی۔“ (۲۳)

﴿أُولَئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا.....﴾ (الفرقان: ۷۵، ۷۶) کے متعلق فرماتے ہیں

”چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلی آیات میں اپنے مومن بندوں کے پاکیزہ اوصاف اور عمدہ طور طریقوں کا ذکر کیا تھا، اس لئے اس کی مناسبت سے اس آیت میں ان کی جزا کا ذکر کیا ہے۔“ (۲۴)

قرآن مجید میں بعض مقامات پر مومن اور باطل فرقوں کے لئے اُسلوبِ تقابلی اختیار کیا گیا ہے جو اس کے منظم و مربوط ہونے کی بہت بڑی دلیل ہے۔ علامہ ابن کثیرؒ نے یہاں بھی آیتوں کی مناسبت اور ان کا باہمی ربط بیان کیا ہے، مثلاً ﴿وَبَشِّرِ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ.....﴾ (البقرہ: ۲۵) کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

”چونکہ اللہ تعالیٰ نے پہلے اپنے دشمنوں یعنی بد بخت کفار کی سزا اور رسوائی کا تذکرہ کیا تھا، اس لئے اب اس کی مناسبت سے یہاں اس کے مقابلہ میں اپنے دوستوں یعنی خوش قسمت ایماندار صالح و نیک لوگوں کے اجر کا ذکر کر رہا ہے، اور صحیح قول کے مطابق قرآن مجید کے ’مثنائی‘ ہونے کا یہی مطلب ہے کہ ایمان کے ساتھ کفر اور سعادت مندوں کے ساتھ بد بختوں یا اس کے برعکس یعنی کفر کے ساتھ ایمان اور بد بختوں کے ساتھ سعادت مندوں کا تذکرہ کیا جائے۔ اس بحث کا حاصل یہ ہے کہ اگر کسی چیز کے ساتھ اس کے مقابل کا ذکر کیا جائے تو یہ ’مثنائی‘ کہلائے گا اور اگر کسی چیز کے ساتھ اس کے ’امثال و نظائر‘ کا تذکرہ کیا جائے تو یہ ’متشابہ‘ ہوگا۔“ (۲۵)

حروفِ مقطعات پر بحث

حروفِ مقطعات کے بارے میں امام ابن کثیرؒ کا نقطہ نظر یہ ہے:

”جن جاہلوں کا یہ خیال ہے کہ قرآن کی بعض چیزوں کی حیثیت محض تعبیدی ہے، وہ شدید غلطی پر ہیں۔ یہ تو بہر حال متعین ہے کہ ان حروف (مقطعات) کے کوئی نہ کوئی معنی ضرور ہیں، خدا نے ان کو عبث نازل نہیں فرمایا، اگر ان کے متعلق نبی کریم ﷺ سے کوئی بات ثابت ہوگی تو ہم اسے بیان کریں گے اور اگر حدیث سے کوئی بات معلوم نہ ہوگی تو ہم توقف کریں گے اور یہ کہیں گے کہ ﴿آمَنَّا بِهِ كُلٌّ مِنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾

حروفِ مقطعات کے متعلق علمائے امت کا کسی ایک قول اور مفہوم پر اجماع نہیں ہے بلکہ اختلافات ہیں، اس لئے اگر کسی دلیل سے کسی کے نزدیک کوئی مفہوم زیادہ واضح ہے تو اس کو وہ مفہوم اختیار کر لینا چاہئے، ورنہ حقیقتِ حال کے انکشاف تک توقف کرنا چاہئے۔“ (۲۶)

ابن کثیر نے زیر بحث کتاب میں حروفِ مقطعات پر عمدہ بحث کی ہے، اس سلسلے میں وہ مختلف مفسرین کے اقوال کی روشنی میں ان کے معانی و مفاہیم متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ (۲۷)

فضائل سور و آیات

تفسیر ابن کثیر میں سورتوں اور آیتوں کے فضائل و خصوصیات، آنحضور ﷺ کا ان پر تعامل اور امت کو ترغیب و تلقین کا تذکرہ بھی پایا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ابن کثیر نے اہم کتبِ احادیث کے علاوہ امام نسائی کی معروف تصنیف عمل الیوم واللیلۃ اور امام بیہقی کی کتاب الخلائیات سے بھی استفادہ کیا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب کے آغاز میں سورۃ بقرہ اور سورہ آل عمران کے فضائل کا مفصل بیان ہے۔ اسی طرح آیت ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِنَ الْمَثَانِي﴾ (الحجر: ۸۷) کے تحت سبعِ مثنائی کی تفسیر میں سات مطول سورتوں بشمول سورۃ البقرہ و آل عمران کے فضائل و خصائص تحریر کئے گئے ہیں۔ (۲۸)

امام ابن کثیر سورۃ حشر کی آخری تین آیتوں کے متعلق فرماتے ہیں:

”مسند احمد کی حدیث میں ہے کہ جو شخص صبح کو تین مرتبہ أعوذ بالله السميع العليم من الشیطن الرجیم پڑھ کر سورۃ حشر کی آخری تین آیتوں کو پڑھ لے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے ستر ہزار فرشتے مقرر کرتا ہے جو شام تک اس پر رحمت بھیجتے ہیں اور اگر اسی دن اس کا انتقال ہو جائے تو شہادت کا مرتبہ پاتا ہے اور جو شخص انکی تلاوت شام کے وقت کرے، وہ بھی اسی حکم میں ہے۔“ (۲۹)

امام صاحب ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ”جادو کو دور کرنے اور اس کے اثر کو زائل کرنے کے لئے سب سے اعلیٰ چیز معوذتین یعنی سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ان جیسا کوئی تعویذ نہیں۔ اسی طرح آیت الکرسی بھی شیطان کو دفع کرنے میں اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔“ (۳۰)

اشعار سے استشہاد

ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں ایک انداز یہ بھی اختیار کیا ہے کہ وہ کسی آیت کے معنی و مفہوم کو واضح

کرنے کیلئے حسبِ موقع عربی اشعار پیش کرتے ہیں۔ یہ طرز غالباً انہوں نے طبری سے حاصل کیا ہے۔
آیت ﴿قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقَى﴾ (النساء: ۷۷) کی تفسیر بیان کرتے ہوئے موصوف نے ابو مصہر کے یہ اشعار بیان کئے ہیں:

ولا خير في الدنيا لمن لم يكن له
فان تعجب الدنيا رجالا فإنها
”اس شخص کے لئے دنیا میں کوئی بھلائی نہیں جس کو اللہ کی طرف سے آخرت میں کوئی حصہ ملنے والا نہیں۔ گویا دنیا بعض لوگوں کو پسندیدہ معلوم ہوتی ہے، لیکن دراصل یہ معمولی سا فائدہ ہے اور وہ بھی ختم ہونے والا ہے“

آیت ﴿وَإِنِّي لَا ظَنُّكَ يَفْعُورُونَ مَثْبُورًا﴾ (بنی اسرائیل: ۱۰۲) میں لفظ مَثْبُور کے معنی ہلاک ہونا۔ ابن کثیر کہتے کہ یہ معنی عبداللہ بن زبیری کے اس شعر میں بھی ہیں:

إذا جار الشيطان في سنن الغي
و من مال ميله مَثْبُور
”جب شیطان سرکشی کے طریقوں پر چلتا ہے اور پھر جو لوگ بھی اس کے طریقے پر چلیں تو وہ ہلاک ہو جاتے ہیں۔“

لغت عرب سے استدلال

ابن کثیر تفسیر میں لغت سے بھی استدلال کرتے ہیں اور اقوال عرب کو نظائر و شواہد کے طور پر پیش کرتے ہوئے آیت کی تشریح و توضیح کرتے ہیں مثلاً ﴿فَقَلِيلًا مَّا يُؤْمِنُونَ﴾ (البقرة: ۸۸) کے متعلق لکھتے ہیں

”اس کے ایک معنی یہ ہیں کہ یہ بالکل ایمان نہیں رکھتے، جیسے عرب کہتے ہیں ”قلما رأيت مثل هذا قط“ مطلب یہ ہے کہ میں نے اس جیسا بالکل نہیں دیکھا“ (۳۳)

﴿يَسْتُلُونَكَ مَاذَا أَجَلَ لَهُمْ قُلْ أَجَلُكُمْ الطَّيِّبَتِ وَمَا عَلَّمْتُمْ مِنَ الْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ﴾ (المائدة: ۴) کی تفسیر میں لفظ ’جوارح‘ کو زیر بحث لاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”شکاری حیوانات کو ’جوارح‘ اس لئے کہا گیا ہے کہ ’جرح‘ سے مراد کسب اور کمائی ہے، جیسے کہ عرب کہتے ہیں: فلان جرح أهله خيراً یعنی فلاں شخص نے اپنے اہل و عیال کے لئے بھلائی حاصل کر لی ہے۔ نیز عرب کا ایک قول یہ بھی ہے: فلان لا جرح له ”یعنی فلاں شخص کا کوئی کمانے والا نہیں“ (۳۴)

جمہور مفسرین اور ابن کثیر

ابن کثیر اپنی تفسیر میں متقدمین علماء تفسیر کے مختلف اقوال کا قدرِ مشترک تلاش کر کے اس کو ہم معنی

ثابت کرتے ہیں اور اکثر جمہور علماء اہل سنت والجماعت کے نقطہ نظر سے اتفاق کرتے ہیں مثلاً آیت ﴿وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ﴾ (البقرة: ۱۸۵) کے تحت ابن کثیر قضا روزوں کے مسئلہ پر جمہور کا یہ مسلک اختیار کرتے ہیں کہ قضا روزے پے در پے رکھنا واجب نہیں بلکہ یہ مرضی پر منحصر ہے کہ ایسے روزے الگ الگ دنوں میں رکھے جائیں یا متواتر دنوں میں۔^(۳۵)

ابن کثیر نقل و روایت میں مقلد نہ تھے بلکہ ان کی تنقید و تردید بھی کرتے تھے، اس لئے وہ سلف کی تفسیروں کے پابند ہونے کے باوجود بعض اوقات ان کی آرا سے اختلاف بھی کرتے ہیں، مثلاً آیت ﴿فَلَمَّا أَنْهَمَ صَالِحًا جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا أَنْهَمَا.....﴾ (الاعراف: ۱۹۰) کی تفسیر میں ابن عباسؓ کی روایت بیان کی ہے کہ حضرت حوا کی جو اولاد پیدا ہوئی، وہ ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لئے مخصوص کر دیتی تھیں اور ان کا نام عبداللہ، عبید اللہ وغیرہ رکھتی تھیں لیکن یہ بچے مر جاتے تھے۔ ایک دن ابلیس حضرت آدمؑ و حواؑ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر تم اپنی اولاد کا کوئی اور نام رکھو گے تو وہ زندہ رہے گی۔ اب حواؑ کا جو بچہ پیدا ہوا تو ماں باپ نے اس کا نام عبداللہ رکھا۔ اسی بنا پر اللہ نے فرمایا: ﴿جَعَلَا لَهُ شُرَكَاءَ فِيمَا أَنْهَمَا﴾ ”اللہ کی دی ہوئی چیز میں وہ دونوں اللہ کے شریک قرار دینے لگے۔“ پھر ابن کثیر لکھتے ہیں:

”اس روایت کو ابن عباسؓ سے ان کے شاگرد مجاہد، سعید بن جبیر، عکرمہ اور طبقہ ثانیہ کے قتادہ اور سدی وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح سلف سے خلف تک بہت سے مفسرین نے اس آیت کی یہی تفسیر کی ہے، لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہ واقعہ اہل کتاب سے لیا گیا ہے، اس کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ ابن عباسؓ اس واقعہ کو ابی بن کعب سے روایت کرتے ہیں، جیسے کہ ابن ابی حاتم میں ہے لہذا میرے نزدیک یہ اثر ناقابل قبول ہے۔“^(۳۶)

سورہ حج کی آیت ۵۲: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّا إِذَا تَمَنَّى أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِي أُمْنِيَّتِهِ﴾ کے متعلق ابن کثیر کو جمہور کے نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے، چنانچہ لکھتے ہیں:

”یہاں اکثر مفسرین نے ’غریبق‘ کا قصہ نقل کیا ہے اور یہ بھی کہ اس واقعہ کی وجہ سے اکثر مہاجرین حبشہ یہ سمجھ کر کہ اب مشرکین مکہ مسلمان ہو گئے ہیں، واپس مکہ آ گئے، لیکن یہ سب مرسل روایتیں ہیں جو میرے نزدیک مستند نہیں ہیں۔ ان روایات کو محمد بن اسحاق نے سیرت میں نقل کیا ہے، لیکن یہ سب مرسل اور منقطع ہیں۔ امام بغویؒ نے بھی اپنی تفسیر میں ابن عباسؓ اور محمد بن کعب قرظی سے اس طرح کے اقوال نقل کرنے کے بعد خود ہی ایک سوال وارد کیا ہے کہ جب رسول کریمؐ کی عصمت کا محافظ خود خدا تعالیٰ ہے تو ایسی بات کیسے واقع ہوگئی؟ پھر اس کے کئی جوابات دیئے ہیں، جن میں سب سے صحیح اور قرین قیاس جواب یہ ہے کہ شیطان نے یہ الفاظ مشرکین کے کانوں میں

ڈالے، جس سے ان کو یہ وہم ہو گیا کہ یہ الفاظ آنحضور ﷺ کے منہ سے نکلے ہیں۔ حقیقت میں ایسا نہیں تھا بلکہ یہ صرف شیطانی حرکت تھی، رسول اللہ ﷺ کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔“ (۳۷)

علم القراءت اور لغوی تحقیق

ابن کثیر قرآنی آیات کی تفسیر کرتے ہوئے حسب موقع اختلاف قراءت و اعراب، صرنی و نحوی ترکیب اور الفاظ کی لغوی تحقیق کے علاوہ ان کے مصادر، منشیہ، جمع اور اصطلاحی مفہوم بھی بیان کرتے ہیں، مثلاً آیت ﴿وَلَقَدْ مَكَنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَالِشَ﴾ (الاعراف: ۱۰) میں لفظ ‘معالش’ کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

”لفظ معالیش کو سب لوگ ‘ی’ کے ساتھ پڑھتے ہیں یعنی ہمزہ کے ساتھ معالیش نہیں پڑھتے، لیکن عبدالرحمن بن ہریرا اس کو ہمزہ کے ساتھ پڑھتے ہیں، اور صحیح تو یہی ہے جو اکثر کا خیال ہے یعنی بلا ہمزہ، اس لئے کہ معالیش جمع معیشۃ کی ہے۔ یہ مصدر ہے، اس کے افعال عاش، یعیش، معیشۃ ہیں۔ اس مصدر کی اصلیت ہے معیشۃ، کسرہ ‘ی’ پر ثقیل تھا، اس لئے عین کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے۔ اور لفظ مَعِيشَةٍ، مَعِيشَةٍ بن گیا۔ پھر اس واحد کی جب جمع بن گئی تو ‘ی’ کی طرف حرکت پھر لوٹ آئی کیونکہ اب ثقالت باقی نہیں رہی۔ چنانچہ کہا گیا کہ معالیش کا وزن مفاعل ہے، اسلئے کہ اس لفظ میں ‘ی’ اصل ہے بخلاف مدائن، صحائف اور بصائر کے کہ یہ مدینہ، صحیفہ اور بصیرۃ کی جمع ہیں، چونکہ ‘ی’ اس میں زائد ہے، لہذا جمع بروزن فَعَالِل ہوگی اور ہمزہ بھی آئے گا“ (۳۸)

﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لِيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ الْخِ﴾ (الاعراف: ۱۶۷) میں لفظ تَأَذَّنَ پر اس طرح

بحث کرتے ہیں:

”تَأَذَّنَ بروزن تَفَعَّلَ اذ ان سے مشتق ہے یعنی حکم دیا یا معلوم کرایا اور چونکہ اس آیت میں توت کلام کی شان ہے، اس لئے لِيَبْعَثَنَّ کا ‘ل’ معنی قسم کا فائدہ دے رہا ہے، اس لئے ‘ل’ کے بعد ہی یبعثن لایا گیا۔ عَلَيْهِمْ کی تفسیر یہود کی طرف ہے“ (۳۹)

لغوی بحث کی عمدہ مثال ہمیں زیر تبصرہ کتاب کے آغاز میں تعوذ، تسمیہ اور سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں نظر آتی ہے۔ ابن کثیر لفظ ‘صلوٰۃ’ کی تحقیق فرماتے ہیں:

”عربی لغت میں ‘صلوٰۃ’ کے معنی دعا کے ہیں، اُٹھی کا شعر ہے:

لها حارس لا يبرح الدهر بيتها وان ذبحت صلى عليها و زمما
یہ شعر بھی اُٹھی سے منقول ہے:

وقابلها الريح فى دنها وصلى على دنها وارتسم
ان اشعار میں ‘صلوٰۃ’ کا لفظ دعا کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ شریعت میں اس لفظ کا استعمال نماز پر ہے۔ یہ رکوع و سجود اور دوسرے خاص افعال کا نام ہے جو جملہ شرائط، صفات اور اقسام کے

ساتھ سرانجام دیئے جاتے ہیں۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ نماز کو 'صلوٰۃ' اس لئے کہا جاتا ہے کہ نمازی اللہ تعالیٰ سے اپنے عمل کا ثواب طلب کرتا ہے اور اپنی حاجتیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو دو رگیں پیٹھ سے ریڑھ کی ہڈی کے دونوں طرف آتی ہیں، انہیں عربی میں صلوٰین کہتے ہیں۔ چونکہ نماز میں یہ حرکت کرتی ہیں، اس لئے نماز کو صلوٰۃ کہا گیا ہے، لیکن یہ قول ٹھیک نہیں ہے۔ بعض نے یہ کہا کہ یہ ماخوذ ہے صلی سے، جس کے معنی ہیں: چپک جانا اور لازم ہو جانا، جیسا کہ قرآن میں ہے ﴿لَا يَصْلَاهَا﴾ یعنی جہنم میں ہمیشہ نہ رہے گا مگر بد بخت۔ بعض علما کا قول ہے کہ جب لکڑی کو درست کرنے کے لئے آگ پر رکھتے ہیں تو عرب اسے تَصْلِيَّةَ کہتے ہیں۔ چونکہ نمازی بھی اپنے نفس کی کچی اور ٹیڑھ پن کو نماز سے درست کرتا ہے، اس لئے اسے صلوٰۃ کہتے ہیں جیسے قرآن میں ہے: ﴿إِنَّ الصَّلَاةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ﴾ ”یعنی نماز بے حیائی اور برائی سے روکتی ہے اور اللہ کا ذکر ہی بڑا ہے“، لیکن اس کا دعا کے معنی میں ہونا ہی زیادہ صحیح ہے اور زیادہ مشہور ہے۔ واللہ اعلم،^(۳۰)

ابن کثیر مترادفات پر بھی خوبصورت انداز میں بحث کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں قلیل اور تھوڑی مقدار کے لئے بطور تمثیل نَقِير، فَتِيل اور قَطْمِير کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ موصوف سورۃ نساء کی آیت ۱۲۴ ﴿وَمَنْ يَفْعَلْ مِنَ الصَّالِحَاتِ مِنْ ذَكَرٍ أَوْ انْتَىٰ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ نَقِيرًا﴾ کے تحت مذکور الفاظ کی تشریح کرتے ہیں:

وهو النقرة التي في ظهر نواة التمر، وقد تقدم الكلام على الفتيل وهو الخيط الذي في شق النواة وهذا النقيير وهما في نواة التمرة والقطمير وهو اللفافة التي على نواة التمرة والثلاثة في القرآن .

”کھجور کی گٹھلی کی پشت پر جو ذرا سی گٹھلی ہوتی ہے، اسے نقیر کہتے ہیں۔ گٹھلی کے شکاف میں جو ہلکا سا چھلکا ہوتا ہے، اس کو فتیل کہتے ہیں۔ یہ دونوں کھجور کے بیج میں ہوتے ہیں اور بیج کے اوپر کے لفافے کو قَطْمِير کہتے ہیں اور یہ تینوں لفظ اس موقع پر قرآن میں آئے ہیں“^(۳۱)

ناسخ و منسوخ

ناسخ و منسوخ کی شناخت فن تفسیر میں نہایت اہم ہے۔ اس علم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کریم کی کون سی آیت محکم ہے اور کون سی متشابہ۔ مفسر قرآن کے لئے اس علم میں مہارت نہایت ضروری ہے تاکہ وہ صحیح معنوں میں احکامات و مسائل کی توضیح و تشریح کر سکے۔ ابن کثیر اس علم میں بھی دسترس رکھتے تھے۔ وہ ناسخ و منسوخ آیات کی وضاحت، ان کے بارے میں مفسرین اور فقہاء کی اختلافی آراء اور جمہور کی تائید میں اپنے نقطہ نظر کا اظہار کرتے ہیں، مثلاً ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِمْ مَّتَاعًا إِلَى الْحَوْلِ الخ﴾ (البقرة: ۲۴۰) کے متعلق اکثر صحابہ و تابعین سے نقل کرتے

ہیں کہ یہ آیت چار مہینے دس دن والی عدت کی آیت یعنی ﴿وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا﴾ (البقرة: ۲۳۴) سے منسوخ ہو چکی ہے۔^(۴۲)

﴿انْفِرُوا خِفَافًا وَثِقَالًا وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ.....﴾ (التوبة: ۴۱) کے تحت لکھتے ہیں:

”کہ اس آیت میں غزوہ تبوک کے لئے تمام مسلمانوں کو ہر حال میں نبی ﷺ کے ہمراہ جانے کا حکم دیا گیا ہے، خواہ کوئی آسانی محسوس کرے یا تنگی، بڑھاپے کی حالت ہو یا بیماری کا عذر۔ لوگوں پر یہ حکم گراں گزرا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اسے آیت ﴿لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَاءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضَى وَلَا عَلَى الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ مَا يُنْفِقُونَ حَرَجٌ إِذَا نَصَحُوا لِلَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ (التوبة: ۹۱) سے منسوخ کر دیا۔ یعنی ضعیفوں، بیماروں اور تنگ دست فقیروں پر جبکہ ان کے پاس خرچ تک نہ ہو، اگر وہ دین خدا اور شریعت مصطفیٰ ﷺ کے حامی، طرفدار اور خیر خواہ ہوں تو میدان جنگ میں نہ جانے پر کوئی حرج نہیں“^(۴۳)

تلخیص کلام

ابن کثیر کے انداز تفسیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی آیت کی تفسیر میں جامع بحث اور تبصرے کے بعد اس کا خلاصہ تحریر کرتے ہیں اور اخذ کردہ نتائج کو سامنے لاتے ہیں، مثلاً آیت ﴿فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ.....﴾ (البقرة: ۱۸۴) کے متعلق احادیث و اقوال کی روشنی میں طویل گفتگو کے بعد اس کا لب لباب تحریر کیا ہے۔^(۴۴)

آیت ﴿قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّي الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ﴾ (الاعراف: ۳۳) کے تحت تشریح و توضیح کے بعد لکھتے ہیں:

”حاصل بحث تفسیر یہ ہے کہ إثم سے مراد وہ خطائیں ہیں جو فاعل کی اپنی ذات سے متعلق ہیں اور بغی وہ تعدی ہے جو لوگوں تک متجاوز ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں چیزوں کو حرام فرمایا ہے۔“^(۴۵)

خصوصیات

تفسیر ابن کثیر کی چند نمایاں خصوصیات جو اسے دیگر تفاسیر سے ممتاز کرتی ہیں، درج ذیل ہیں:

اسرائیلیات

منقولی تفاسیر کی ایک بڑی خامی یہ ہے کہ ان میں اسرائیلی خرافات کثرت سے نقل کی گئی ہیں، ایسی روایات کے بارے میں ابن کثیر اپنا نقطہ نظر تفسیر القرآن العظیم میں یوں بیان کرتے ہیں:

”ہمارا مسلک یہ ہے کہ تفسیر میں اسرائیلی روایات سے احتراز کیا جائے۔ ان میں پڑنا وقت کا ضیاع ہے۔ اس قسم کی اکثر روایتوں میں جھوٹ بھی ہوتا ہے، کیونکہ اس امت کے ائمہ فن اور ناقدین حدیث کی طرح اہل کتاب نے صحیح و سقیم میں تفریق نہیں کی“،^(۴۶)

اگرچہ تفسیر ابن کثیر بھی اسرائیلیات سے خالی نہیں ہے تاہم اس کی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مؤلف اسرائیلی واقعات محض استشہاد کے طور پر بیان کرتے ہیں۔ جن پر اجمالاً اور بعض اوقات تفصیلاً نقد و جرح کرتے ہیں، مثلاً سورۃ البقرۃ کی آیت: ۶۷ ﴿إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَذَبُّحُوا بِقَرَّةٍ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے بنی اسرائیل کی گائے کا طویل قصہ ذکر کیا ہے۔ پھر اس میں سلف سے منقول روایات تحریر کرنے کے بعد فرماتے ہیں:

”ابو عبیدہ، ابو العالیہ اور سدی سے جو روایات منقول ہیں، ان میں اختلاف ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ روایات بنی اسرائیل کی کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ بلاشبہ ان کو نقل کرنا درست ہے مگر ان کی تصدیق و تکذیب نہیں کی جاسکتی، لہذا ان پر اعتماد کرنا درست نہیں ماسوا اس روایت کے جو اسلامی حقائق کے مطابق ہو“،^(۴۷)

اسی طرح سورۃ انبیاء کی آیت ۵۱ ﴿وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا بِهِ عَالِمِينَ﴾ کے تحت تحریر کرتے ہیں:

”یہ جو قصے مشہور ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کے دودھ پینے کے زمانے میں ہی ان کی والدہ نے انہیں ایک غار میں رکھا تھا جہاں سے وہ مدتوں بعد باہر نکلے اور مخلوقات خدا پر خصوصاً چاند، تاروں وغیرہ پر نظر ڈال کر خدا کو پہچانا، یہ سب بنی اسرائیل کے افسانے ہیں۔ ان میں سے جو واقعہ کتاب و سنت کے مطابق ہو وہ سچا اور قابل قبول ہے اس لئے کہ وہ صحت کے مطابق ہے اور جو خلاف ہو وہ مردود اور ناقابل قبول ہے اور جس کی نسبت ہماری شریعت خاموش ہو، مخالفت و موافقت کچھ نہ ہو، گو اس کا روایت کرنا بقول اکثر مفسرین جائز ہے، لیکن نہ تو ہم اسے سچا کہہ سکتے ہیں نہ غلط۔ ان (اسرائیلیات) میں سے اکثر واقعات ایسے ہیں جو ہمارے لئے کچھ سند نہیں اور نہ ہی ان میں ہمارا کوئی دینی نفع ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہماری جامع، نافع، کامل و شامل شریعت اس کے بیان میں کوتاہی نہ کرتی“،^(۴۸)

لیکن زیر بحث تفسیر کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیرؒ اسرائیلیات کے بارے میں اپنے موقف اور نظریہ پر مکمل طور پر کاربند نہ رہ سکے اور تساہل و تسامح اختیار کرتے ہوئے بعض ایسی روایات بھی بیان کی ہیں جن کو فی الواقع خود ان کے اصول کے مطابق اس تفسیر میں شامل نہیں کرنا چاہئے تھا، مثلاً ﴿اتَّخَذَ اللَّهُ إِبْرَاهِيمَ خَلِيلًا﴾ (النساء: ۱۲۵) کے متعلق ابن جریرؒ کے حوالے سے ایک اسرائیلی روایت ذکر کی ہے جس کی حقیقت داستان سے زیادہ کچھ بھی نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

□ محافل قراءت میں اللہ اللہ کہنا □ آیات کا جواب دینا □ نابالغ لڑکے کی امامت

سوال: محافل قراءت میں قاری صاحبان تلاوت کرتے ہیں تو سامعین حضرات اونچی آواز سے اللہ اللہ کہہ کر قاری صاحب کو داد دیتے ہیں۔ قرآن و سنت کی رو سے اس کی کیا حیثیت ہے اور کہاں تک گنجائش ہے؟

جواب: قاری کی تلاوت کے دوران اللہ اللہ کہہ کر داد دینے کا شریعت میں کوئی ثبوت نہیں بلکہ یہ عمل نص قرآنی ﴿وَإِذَا قُرِئَ الْقُرْآنُ فَاسْتَمِعُوا لَهُ وَأَنْصِتُوا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ﴾ (الاعراف: ۲۰۴) ”اور جب قرآن پڑھا جائے تو توجہ سے سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔“ کے خلاف ہے۔ حق بات یہ ہے کہ ایسے لوگوں کو معافی و مغایہم سے ناواقفی کی بنا پر الفاظ قرآن سے دراصل لذت و سرور حاصل ہی نہیں ہوتا بلکہ ان کی لطف اندوزی محض قاری کی نغمہ سرائی پر موقوف ہے اور وہ اس کی حسین و جمیل آواز پر مر مٹنے والے ہیں۔ اگرچہ تحسین صوت بھی مطلوب امر ہے لیکن امام مناوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”قرآنی حروف کو ان کی حدود سے متجاوز کرنا حرام ہے۔“ پھر عامۃ الناس کی دلچسپی کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی سادہ آواز میں قرآن پڑھتا ہے تو سننے کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ نفرت کا اظہار کرتے ہیں جبکہ قرآن میں مومنوں کے اوصاف یوں بیان ہوئے ہیں: ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَّتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا﴾ (الانفال: ۲) ”مومن تو وہ ہیں، جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے۔“

نیز فرمایا: ﴿تَفْشَعُ رَمُومُهُ جُلُودَ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُودَهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ ذَلِكِ هَدَىٰ اللَّهُ يَهْدِي بِهِ مَنْ يَشَاءُ وَمَنْ يُضْلِلِ اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ﴾ (الزمر: ۲۳)

”جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں، ان کے بدن کے روگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں پھر ان کے بدن اور دل نرم (ہو کر) اللہ کی یاد کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ یہی اللہ کی ہدایت ہے وہ اس سے جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو اللہ گمراہ کرے، اس کو کوئی ہدایت دینے والا نہیں۔“

پھر صحیح حدیث میں ہے، حضرت ابن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے نبی ﷺ کے سامنے قرآن کی تلاوت کی ”فالتفت إليه فاذا عيناه تدمعان“ (متفق علیہ) ”ناگہانی میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا تو آپؐ کی دونوں آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔“ اس سے معلوم ہوا کہ قرآنی تاثیر کا تقاضا یہ ہے کہ اس کے اثرات انسان کے دل و دماغ پر ظاہر ہوں نہ کہ اللہ اللہ، کمان کمان، یا استاذ ہیہ کہہ کر خانہ پری کی جائے، اس سے اجتناب انتہائی ضروری ہے۔ (السنن واللمتدعات: صفحہ ۲۱۹/۲۲۰)

سوال: کیا قراء کرام کا اختتام تلاوت پر صدق اللہ العظیم قسم کے الفاظ کہنا جائز ہے؟

جواب: قراءت کے اختتام پر صدق اللہ العظیم کہنا کتاب و سنت سے ثابت نہیں۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے: ”من أحدث في أمرنا هذا ما ليس منه فهو رد“ ”جو دین میں اضافہ کرے وہ مردود ہے“ پھر متعدد صحابہ کرامؓ کی تلاوتوں کے تذکرے احادیث کی کتابوں میں مرقوم ہیں لیکن کسی ایک سے بھی یہ کلمات ثابت نہیں ہو سکے۔ اگر کوئی کہے قرآن میں ہے: ﴿قُلْ صَدَقَ اللَّهُ﴾ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ کا

فرمان اپنی جگہ برحق ہے لیکن اس میں یہ کہاں ہے کہ جب تم تلاوت ختم کرو تو یہ کہو۔ ابن مسعودؓ کی تلاوت سن کر آپ نے فرمایا: حَسْبُكَ تیرے لئے یہ کافی ہے۔ یہ نہیں فرمایا: صدق اللہ العظیم لہذا اس سے احتراز ضروری ہے۔

سوال: اسی طرح جب قاری صاحب آیات عذاب یا آیات انعام تلاوت کرتا ہے تو کیا سامعین اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ اگر دے سکتے ہیں تو سر اُٹھنا چاہئے یا جہراً۔ نیز حالت نماز میں اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: سامع یا مقتدی کا قاری کی تلاوت سے بعض آیات کا جواب دینا احادیث صحیحہ سے ثابت نہیں، البتہ قاری یا امام کے لئے ثابت ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں حضرت حذیفہؓ رسول اکرم ﷺ سے رات کی نماز کی کیفیت نقل کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپؐ جب کسی ایسی آیت سے گزرتے جس میں تسبیح کا ذکر ہوتا تو تسبیح کرتے اور جب سوال (والی آیت) سے گزرتے تو سوال کرتے اور جب تعوذ (والی آیت) سے گزرتے تو پناہ پکڑتے۔

عمیر بن سعید سے روایت ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے نماز جمعہ میں ﴿سَبِّحْ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى﴾ پڑھنے پر سُبْحَانَ رَبِّيَ الْأَعْلَى کہا۔ بیہقی (۳۱۱/۲) مصنف عبدالرزاق (۲۵۱/۲) اس اثر کی سند صحیح ہے۔ اسی طرح حضرت علیؓ سے بھی اس موقع پر یہی کلمات کہنا بسند حسن ثابت ہے۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ”القول المقبول فی تخریج وتعلیق صلوٰۃ الرسول ﷺ“

اس موضوع پر عرصہ قبل ماہنامہ ”محدث“ میں ایک تفصیلی فتویٰ جواب در جواب شائع شدہ ہے جو اباب ذوق کیلئے کافی مفید ہے۔ اس فتویٰ میں حافظ محمد ابراہیم کیرپوری، سید نذیر حسین دہلوی کی آراء پر تعلیقات کے علاوہ مولانا عطاء اللہ حنیف کا تبصرہ بھی بڑی تفصیل سے موجود ہے۔ دیکھئے محدث: ج ۹ عدد ۱، صفحات ۳ تا ۲۳ بابت دسمبر ۱۹۷۸ء

سوال: کیا کوئی نابالغ بچہ صرف حافظ قرآن ہونے کی بنا پر رمضان میں تراویح یا غیر رمضان میں امامت کروا سکتا ہے، جبکہ بالغ باشرع، پختہ شق حفاظ موجود ہوں اور نابالغ حافظ بے قاعدگی سے نماز ادا کرتا ہو۔

جواب: نابالغ متمیز بچہ اہلیت کی بنیاد پر امامت کرا سکتا ہے۔ صحیح بخاری وغیرہ میں عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ کا قصہ اس امر کی واضح دلیل ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ”فكنت أحفظ ذلك الكلام“ جو کلام لوگ نقل کرتے، میں اسے یاد کر لیتا“ اور ابوداد کی روایت میں ہے ”كنت غلاما حافظا فحفظت من ذلك قرآن كثيرا“ میں یاد کرنے والا بچہ تھا۔ میں نے بہت سارا قرآن اس طرح سے یاد کر لیا تھا۔ بعض حنفیہ وغیرہ نے اس پر اعتراض کیا ہے کہ اس کی امامت نبی ﷺ کے فرمان سے نہ تھی، لہذا قابل جہت نہیں۔ اس کا جواب یہ ہے کہ زمانہ وحی میں کسی واقعہ کا وقوع پذیر ہونا جواز کی دلیل ہے۔ حضرت ابوسعید اور جابرؓ نے ’عزل‘ کے جواز پر دلیل اس امر سے قائم کی کہ عہد نبوت میں ہوتا تھا اور اس سے روکا نہیں گیا۔ اور اگر یہ فعل ناجائز ہوتا تو اللہ اپنے نبی ﷺ کو اس بات سے آگاہ فرما دیتا ﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا﴾ جس طرح کہ بحالت نماز آپؐ کی طرف وحی نازل ہوئی کہ جوتا میں گندگی لگی ہے۔ آپؐ نے اس کو اتار دیا، اس طرح معاملہ یہاں بھی ہو سکتا تھا۔ اس فعل سے منع نہ کرنا جواز کی دلیل ہے۔

حضرت عمرو بن سلمہ رضی اللہ عنہ فرض نماز میں امام تھے۔ وتر اور تراویح تو فرضوں کی نسبت معمولی شئی ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: ہم (عورتیں) معمول سے نابالغ لڑکے لاکران کو امام بنا لیتیں۔ وہ ہم کو ماہ رمضان میں نماز پڑھاتے، ہم ان کو (بطور خدمت) بھنا ہوا گوشت اور گندم کی روٹی کھلا دیا کرتی تھیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ نابالغ بچے گھروں میں عورتوں کو تراویح پڑھاتے تھے۔ ابن شہاب زہری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: ”نابالغ بچے جو نماز پڑھنا اور قرآن پڑھنا جانتے تھے، وہ رمضان اور غیر رمضان میں لوگوں کو نماز میں پڑھاتے تھے“۔ (قیام اللیل: صفحہ ۱۷۴) باب إمامة الغلام الأدرلم يحتلم فی رمضان وغیرہ، تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: مرعاة المفاتیح (۱۱۲/۲ تا ۱۱۴)

مالی بدعنوانیوں کا انسداد، سیرتِ نبویؐ کی روشنی میں

ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ ایک روز کھڑے ہوئے تاکہ ہمیں کوئی نصیحت فرمائیں۔ آپؐ نے غنیمت کے مال میں چوری کرنے کو بڑا گناہ قرار دیا۔ آپؐ نے فرمایا:

”میں قیامت کے دن تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ آئے اور اس کی گردن پر ایک اونٹ بلبلا رہا ہو اور کہتا ہو کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد فرمائیں اور میں اسے کہوں کہ مجھے کچھ اختیار نہیں ہے..... (پھر فرمایا) کہ میں تم میں سے نہ پاؤں قیامت کے دن کہ وہ میرے پاس آئے، اپنی گردن پر ایک گھوڑا لادے ہوئے ہو جو ہنہار رہا ہو اور کہے یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد کیجئے! میں کہوں کہ مجھے کوئی اختیار نہیں ہے۔ میں تو تجھے بتا چکا تھا کہ چوری کی بہت بڑی سزا ہے۔ پھر تو نے کاہے کو چوری کی۔ (پھر آپؐ نے فرمایا کہ) میں نہ پاؤں تم میں سے کسی کو کہ قیامت کے روز میرے پاس آئے اور اپنی گردن پر ایک بکری اٹھائے ہوئے ہو جو میاں رہی ہو اور کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد کیجئے اور میں کہوں کہ مجھے کوئی اختیار نہیں (کہ تجھے اس جرم کی سزا سے بچا سکوں) میں نے تو تجھے چوری کی سزا کے بارے میں اللہ کا حکم پہنچا دیا تھا۔ اسی طرح آپؐ نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن کسی کو نہ پاؤں کہ وہ کسی جان کو اٹھائے ہوئے ہو جو چلا رہی ہو (کہ اس نے اس جان کو تلف کیا تھا) پھر کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد کیجئے۔ میں کہوں کہ مجھے تجھے چھڑانے کا اختیار نہیں ہے میں تو تجھے اللہ کا حکم پہنچا چکا تھا۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ میں قیامت کے روز کسی کو اس حالت میں نہ پاؤں کہ اپنی گردن پر کپڑوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو جو اس نے اوڑھے ہوں (اور جنہیں اس نے چرایا تھا) یا کاغذ کے چند ٹکڑے اٹھائے ہوئے آئے جن پر وہ حقوق لکھے ہوں جو اس کے ذمہ تھے یا اور چیزیں جو بیل رہی ہوں جنہیں اس نے دنیا میں چرایا تھا۔ پھر مجھے کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد کیجئے اور میں اسے کہہ دوں کہ میں تو اس سلسلے میں تمہیں اللہ کا حکم پہنچا چکا ہوں۔ پھر آپؐ نے فرمایا کہ تم میں سے کسی کو نہ پاؤں کہ وہ قیامت کے دن اس حالت میں میرے پاس آئے کہ اپنی گردن پر سونا چاندی وغیرہ کا بوجھ اٹھائے ہو اور کہے کہ یا رسول اللہ ﷺ! میری مدد کیجئے اور میں کہہ دوں کہ میں کوئی اختیار نہیں رکھتا، میں تو تمہیں اللہ کا حکم پہنچا چکا تھا۔“ (۱)

سنن ابوداؤد میں حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی ہے کہ ہم خیر کے سال رسول اللہ ﷺ کے ساتھ نکلے۔

غنیمت میں سونا اور چاندی حاصل نہیں ہوا بلکہ کپڑے اور مال واسباب ملا۔ آپؐ جب وادی القریٰ کی طرف روانہ ہوئے تو آپؐ کو ایک حبشی غلام ’مدعم‘ نامی ہدیہ میں دیا گیا۔ مدینہ واپس پہنچ کر یہ شخص آپؐ کے اونٹ کا پالان اتار رہا تھا کہ اچانک اسے ایک تیر لگا اور وہ مر گیا۔ لوگوں نے کہا کہ اس کے لئے جنت مبارک ہو۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہرگز نہیں، قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، وہ مکمل جس کو اس نے خیر کی لڑائی کے مال غنیمت میں چرایا تھا، آگ بن کر اس پر لپٹ کر جل رہا ہے۔ جب لوگوں نے یہ بات سنی تو ایک شخص ایک یادو تھے آپؐ کے پاس لے کر آیا تو آپؐ نے فرمایا کہ یہ ایک یادو تھے آگ کے تھے۔‘ (۷۲)

غنیمت کا مال چرانا تو دور کی بات ہے، آپؐ نے تو اس بات سے بھی منع فرما دیا کہ غنیمت کے کسی جانور کو وقتی طور پر سواری کے لئے استعمال نہ کیا جائے، نہ ہی کوئی کپڑا پہنا جائے، سنن ابوداؤد میں فرمان نبویؐ ہے، فرمایا:

من كان يؤمن بالله وباليوم الآخر فلا يركب دابة من فئ المسلمين حتى إذا اعفها ردّها فيه ومن كان يؤمن بالله وباليوم الآخر فلا يلبس ثوبا من فئ المسلمين حتى إذا خلفه ردّه فيه

”جو شخص اللہ تعالیٰ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو، اسے چاہئے کہ وہ مسلمانوں کے مال میں سے کسی جانور پر سوار نہ ہو کہ اسے دہلا پتلا کر کے غنیمت میں واپس لوٹا دے اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتا ہو تو مسلمانوں کے مال میں سے کوئی کپڑا نہ پہنے حتیٰ کہ کپڑے کو پرانا کر دے اور غنیمت کے مال میں واپس کر دے۔“

اس حدیث مبارکہ کا یہ معنی نہیں ہے کہ اگر سواری کے جانور کے دبلے پتلے ہو جانے اور پہننے کے کپڑے کے پرانا ہو جانے کا خدشہ نہ ہو تو اس جانور اور کپڑے کو استعمال کرنا جائز ہے۔ بلکہ فرمایا یہ گیا ہے کہ سواری کرنے کا مطلب یہی ہے کہ جانور کمزور ہو جاتا ہے اور کپڑے پہننے سے پرانے ہو جاتے ہیں لہذا نہ جانور استعمال کرو، نہ کپڑا پہنو۔

نبی کریم ﷺ کے متعدد فرامین اس سلسلے میں بھی منقول ہیں کہ آپؐ نے ایسے شخص کے لئے جنت کی بشارت سنائی ہے جو کسی منصب پر فائز کیا گیا اور اس نے کسی مالی بددیانتی کا ارتکاب نہیں کیا۔ ترمذی شریف میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ”جو شخص فوت ہوا اور وہ تین باتوں سے پاک ہے تو وہ شخص جنت میں داخل ہوا۔ یہ تین باتیں تکبر، مالی بددیانتی (غلول) اور قرض ہیں۔“ (۷۳) ان تین باتوں میں آخری دو کا تعلق حقوق العباد کے ساتھ ہے اور حقوق العباد میں مداخلت کرنے والے کے لئے ویسے بھی حکم یہ ہے کہ صرف

متاثرہ شخص کے معاف کرنے سے ہی معاف ہوتے ہیں اور جب تک وہ معاف نہ کرے، کوئی شخص خواہ کتنا ہی نیک کیوں نہ ہو، جنت میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ گویا مال غنیمت میں بددیانتی کرنے والے کے لئے دونوں طرح سے وعید سنائی گئی ہے کہ وہ جہنم کا مستحق بھی ٹھہرایا گیا اور جنت سے بھی محروم قرار دیا گیا۔ عبد اللہ بن مغیرہ سے روایت ہے:

أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ ﷺ أَتَى النَّاسَ فِي قَبَائِلِهِمْ يَدْعُوْنَهُمْ وَأَنَّهُ تَرَكَ قَبِيلَةَ مِنَ الْقَبَائِلِ قَالَ وَإِنْ الْقَبِيلَةَ وَجَدُوا فِي بَرْدَعَةَ رَجُلٍ مِنْهُمْ عَقَدَ جَزَعٌ غُلُولًا فَأَتَاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ فَكَبَّرَ عَلَيْهِمْ كَمَا يَكْبُرُ عَلَى الْمَيِّتِ

”نبی کریم ﷺ لوگوں کی جماعتوں کے سامنے تشریف لائے تو سب جماعتوں کے لئے آپؐ نے دعا فرمائی مگر ایک جماعت کے لئے دعا نہیں فرمائی۔ کیونکہ اس جماعت میں ایک شخص ایسا تھا جس کے پاس سے ایک کنٹھا نکلا تھا۔ جب آپؐ اس جماعت کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے اس طرح تکبیر کہی جیسے جنازے پر کہتے ہیں۔“

نبی کریم ﷺ نے لوگوں پر واضح فرمادیا کہ غنیمت کے مال میں بددیانتی بہت بڑا جرم ہے۔ یہ مالی بدعنوانی بھی ہے، چوری بھی۔ یہ اخلاقی جرم بھی ہے اور قومی جرم بھی۔ یہ دھوکہ دہی بھی ہے اور حقوق العباد اور حقوق اللہ میں مداخلت بھی۔ اخلاقی اعتبار سے بھی اس جرم کے بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں: ”جو قوم غنیمت کے مال میں بددیانتی کرتی ہے، ان کے دلوں میں بزدلی پیدا ہو جاتی ہے۔“ طبرانی میں اس روایت کا رفع رسول اللہ تک موجود ہے۔^(۷۵)

حضرت سمرہ بن جندبؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ فرماتے تھے: ”جو شخص غنیمت میں خیانت کرنے والے کی خیانت کو چھپائے۔ یعنی امام کے سامنے ظاہر نہ کرے کہ فلاں شخص نے خیانت کی ہے تو وہ بھی خیانت کرنے والے جیسا ہے، یعنی گناہ میں برابر کا شریک ہے۔“^(۷۶)

نبی کریم ﷺ نے مالی بدعنوانیوں کے تمام راستے مسدود کر دیئے۔ آپؐ نے حکمران کو منع فرمادیا ہے کہ وہ اپنی رعایا کے ساتھ تجارت نہ کرے۔ فرمایا:

مَنْ أَخُونِ الْخِيَانَةِ تِجَارَةَ الْوَالِي فِي رَعِيَّتِهِ

”بدترین خیانت یہ ہے کہ والی اپنی رعایت کے ساتھ تجارت کرے۔“

اس کا سبب یہ ہے کہ ہو سکتا ہے والی اپنے منصب کے بل بوتے پر لوگوں کو متاثر کرے اور ناجائز مراعات حاصل کرے۔

مال غنیمت میں خیانت کرنے والے کی سزا

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”جب تم دیکھو کہ کسی نے مال غنیمت کے مال میں سے چوری کی ہے تو اس کا سامان جلا ڈالو اور اسے مارو“ راوی نے بتایا کہ اس شخص کے سامان میں ایک مصحف (قرآن مجید کا نسخہ) بھی تھا..... یہ مصحف بیچ ڈالا گیا اور اس کا ہدیہ اللہ کی راہ میں کسی کو دے دیا گیا۔^(۷۸)

ابوداؤد میں اس سلسلے میں مزید روایات بھی ہیں۔ ایک روایت میں راوی کا بیان ہے کہ ہم نے ولید بن ہشام بن عبدالملک بن مروان کے ساتھ جہاد کیا اور ہمارے ساتھ سالم بن عبداللہ بن عمر اور عمر بن عبدالعزیز بھی تھے۔ ایک شخص نے مال غنیمت میں سے چوری کی۔ ولید نے حکم دیا کہ اس کا سامان جلا ڈالا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ پھر اس شخص کو لوگوں میں پھرایا گیا اور مال غنیمت میں سے اس کا اپنا حصہ بھی نہ دیا گیا۔ ابوداؤد لکھتے ہیں کہ یہ روایت بہت صحیح ہے اور اسے بہت سے اور لوگوں نے بھی روایت کیا ہے۔ اسی جگہ ابوداؤد میں یہ روایت بھی ہے کہ ولید نے زیاد بن سعد کا سامان بھی جلا ڈالا۔ کیونکہ اس نے بھی مال غنیمت میں سے چوری کی تھی۔ اسی جگہ ایک اور سند سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ نے غنیمت میں خیانت کرنے والے کا سامان جلا ڈالا۔ اسے مارا گیا اور اسے غنیمت میں سے اس کا حصہ بھی نہ دیا گیا۔^(۷۹)

اس روایت کے بارے میں امام علیؓ بن مدینی اور امام بخاریؒ وغیرہ فرماتے ہیں کہ یہ حدیث منکر ہے۔ امام دارقطنیؒ فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ یہ حضرت سالم کا اپنا فتویٰ ہے۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ اور ان کے ساتھیوں، اسی طرح حضرت حسنؒ اور حضرت علیؒ کا یہی نقطہ نگاہ ہے۔ حضرت علیؒ فرماتے ہیں کہ اسے کچھ سزا بھی دی جائے اور مال غنیمت میں سے اس کا حصہ بھی اسے نہ دیا جائے۔^(۸۰)

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور جمہور ائمہ کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اس کا سامان جلایا نہ جائے، صرف اس کے جرم کے مطابق اسے تعزیر کے طور پر سزا دی جائے۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے خان کے جنازے میں شرکت نہیں فرمائی لیکن اس کا سامان جلایا نہیں۔^(۸۱) خود ابوداؤد نے بھی باب قائم کیا ہے کہ جب کوئی غنیمت میں سے حقیر سی چیز چرائے تو مال جلایا نہ جائے۔^(۸۲)

علامہ نوویؒ فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ غلول یعنی غنیمت کے مال میں سے چوری کرنا حرام اور کبیرہ گناہ ہے۔ اگر چرایا ہے تو اسے واپس کر دے۔ اگر لشکر بکھر جائے اور یہ مال حقداروں میں تقسیم کرنا ممکن نہ ہو تو اس میں علما کا اختلاف ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ وہ مال امام کے

سپرد کر دیا جائے، اس میں علما کا ایک گروہ ان کا ہم نوا ہے۔ البتہ حضرت ابن مسعودؓ، ابن عباسؓ، معاویہؓ اور حسنؓ، زہریؓ، اوزاعیؓ، مالکؓ، ثورثیؓ، لیث بن سعدؓ اور امام احمدؓ اور جمہور علما کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اس کا پانچواں حصہ (خمس) امام کو ادا کر دیا جائے اور باقی کا صدقہ کر دیا جائے۔ چرانے والے کو امام جس طرح کی سزا چاہے دے لے، لیکن اس کا مال و اسباب اور گھر جلایا نہ جائے۔ امام مالکؓ، امام شافعیؓ اور امام ابوحنیفہؓ کا یہی نقطہ نگاہ ہے۔ مکحولؓ، حسنؓ اور اوزاعیؓ کے نزدیک اس کا گھر اور اسباب سب جلا دیا جائے گا۔ صرف ہتھیار اور جو کچھ اس نے پہنے ہوں، وہ نہیں جلائے جائیں گے۔^(۸۳)

مال غنیمت میں سے جو شخص کوئی چیز چراتا ہے اسے 'غال' (خائن) اور اس فعل کو 'غلول' (خیانت) کہا جاتا ہے۔ غال کے بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ اس کا جنازہ نبی کریم ﷺ نے نہیں پڑھا۔ زید بن خالد جہنیؓ سے روایت ہے کہ خیبر کے دن ایک جہنی شخص فوت ہوا۔ نبی کریم ﷺ کے سامنے اس شخص کی وفات کا ذکر کیا گیا تو آپؐ نے فرمایا: "صلوا علی صاحبکم" (یعنی اپنے ساتھی کا جنازہ تم خود ہی پڑھو) آپؐ کی بات سن کر لوگوں کے چہرے متغیر ہو گئے۔ یہ دیکھتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: "إن صاحبکم غلّ من الغنیمۃ" (تمہارے ساتھی نے غنیمت کے مال میں سے کوئی چیز چرائی تھی)^(۸۴) امام احمدؓ نے اس سے یہ اخذ کیا ہے کہ آپؐ کا یہ فرمانا کہ تم جنازہ پڑھ لو اور خود نہیں پڑھا، کہ امام کے لئے مناسب نہیں کہ وہ 'غال' کی نماز جنازہ پڑھے۔ اس کے علاوہ باقی تمام لوگ جنازہ پڑھیں گے۔^(۸۵) یہ درحقیقت بددیانتی کے جرم کی شدت کے اظہار کی ایک صورت ہے۔

زکوٰۃ جمع کرنے والے کا ظالمانہ رویہ

مالیاتی شعبے میں ایک اور شعبہ جس میں عام طور پر خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جو حکمرانوں اور عوام کے درمیان فاصلے بڑھا دیتی ہیں وہ مال جمع کرنے والوں کا عوام کے ساتھ ظالمانہ رویہ ہے۔ یہ لوگوں سے محصول اور زکوٰۃ کے نام پر مقررہ شرح سے زائد وصول کرتے ہیں۔ ایسا کرنے والے شخص کو صاحب کس کہا گیا ہے۔ اس سے مراد وہ شخص ہے جو متعینہ شرح سے زیادہ ازراہ زیادتی وصول کرتا ہے۔^(۸۵a) ان لوگوں کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ ٹیکس وصول کرتے وقت اپنی ذاتی جیب کے لئے لوگوں سے زیادہ رقم کا مطالبہ کرتے ہیں۔ جو ٹیکس دہندہ ان کا مطالبہ پورا کر دیتا ہے، اسے کسی نہ کسی طرح چھوٹ اور رعایت مل جاتی ہے اور جو ایسا نہیں کر پاتے، ان کے لئے مشکلات پیدا کی جاتی ہیں۔ آج کے دور میں ان لوگوں کے طرز عمل کو سمجھنے میں کوئی وقت محسوس نہیں ہوگی۔ نبی کریم ﷺ نے ان لوگوں کو سخت ترین الفاظ میں متنبہ فرمایا کیونکہ یہ اپنے منصب سے ناجائز فائدہ بھی اٹھاتے ہیں اور ملکی خزانے کی آمدنی پر بھی اثر انداز ہوتے

ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”لا یدخل الجنة صاحب مکس“^(۸۶) (صاحب مکس جنت میں داخل نہیں ہوگا)
 آپؐ نے فرمایا: ”إن صاحب المكس فی النار“^(۸۷) (صاحب مکس آگ میں ڈالا جائے گا)
 عثمان بن ابی العاصؓ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ حضرت داود
 علیہ السلام اپنے اہل و عیال کے ساتھ رات کے ایک حصے میں جاگتے اور عبادت کیا کرتے تھے..... کیونکہ
 رات میں ایک ایسا لمحہ ہوتا ہے جس میں جو دعا بھی کی جائے، قبول ہوتی ہے۔ سوائے جادو کرنے والے
 اور ٹیکس وصول کرنے والے کے۔“

اس موضوع کی دیگر بھی کئی روایات موجود ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: آدھی رات کو آسمان کے
 دروازے کھول دیئے جاتے ہیں اور ایک پکارنے والا (فرشتہ) پکارتا ہے کہ ہے کوئی سائل کہ اس کی دعا
 کے مطابق اسے عطا کیا جائے۔ ہے کوئی تکلیف میں مبتلا کہ اس کو تکلیف سے نجات دی جائے۔ اس طرح
 کوئی ایسا مسلمان نہیں بچتا کہ اس کی دعا کو قبولیت حاصل نہ ہو۔ سوائے زانیہ عورت یا زیادتی سے محاصل
 وصول کرنے والے شخص کے کہ ان کی دعا قبول نہیں کی جاتی۔^(۸۸)

اس موضوع کی ایک روایت یوں ہے کہ آدھی رات کو اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے (مزید) قریب
 ہو جاتا ہے، ان کی دعائیں قبول کی جاتی ہیں۔ ان کے گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں، سوائے زانیہ اور
 زیادتی سے ٹیکس وصول کرنے والے کے۔^(۸۹)

حضرت ابوسعید خدریؓ اور ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”تمہارے اوپر ایسے حکمران اور عمال مقرر ہوں گے کہ ان کے ارد گرد شریر لوگ جمع ہو جائیں گے۔
 یہ لوگ نمازوں کو مؤخر کر دیں گے۔ تم میں سے جو کوئی ان کے زمانے میں موجود ہو تو نہ ان کا عریف
 (لوگوں کے حالات حکومت تک پہنچانے والا) بنے، نہ ان کا صاحب الشرطة (پولیس مین) بنے اور
 نہ ان کے محاصل وصول کرنے والے تحصیلین بنیں، نہ ان کے خازن۔“^(۹۰)

ان احادیث میں جن لوگوں کو وعید سنائی گئی ہے وہ ایسے لوگ ہیں جو زکوٰۃ، عشر یا کوئی اور ٹیکس وصول
 کرتے وقت لوگوں کو ناجائز طور پر چھوٹ دینے کے لئے ان سے رشوت وصول کرتے ہیں اور جو لوگ
 رشوت نہیں دیتے، ان سے اصل سے زائد ٹیکس وصول کرتے ہیں یا کسی اور طریقے سے لوگوں پر ظلم کرتے
 ہیں۔ نبی کریم ﷺ نے زکوٰۃ وصول کرنے والوں کو بھی تلقین فرمائی ہے کہ وہ لوگوں سے ان کے بہترین
 مال وصول نہ کریں۔ لیکن یہ لوگ آپؐ کی اس تلقین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے ازراہ ظلم ان کے بہترین مال
 وصول کرنے لگیں۔

نبی کریم ﷺ کی عریف کو تنبیہ

اسی طرح کا ایک منصب جس سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے اور جو لوگوں پر ظلم و زیادتی کا باعث بن جاتا ہے 'عرفیف' کہلاتا ہے۔ عریف ایسے شخص کو کہا جاتا ہے جو حاکم کی طرف سے رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لئے مقرر ہوتا ہے۔ اور ضرورت کے وقت اپنی قوم کے مختلف افراد کا رویہ اور کردار رپورٹ کی صورت میں حاکم کے سامنے پیش کرتا ہے۔ زیادہ گمان یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہدے سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے رشوت وصول کریں گے اور رشوت لے کر لوگوں کی غلط سلط رپورٹیں حکمران تک پہنچائیں۔ اس لئے اس طبقے کے بارے میں بھی آپ نے بڑا تنبیہی انداز اختیار فرمایا۔ نبی کریم ﷺ نے اس سلسلے میں ارشاد فرمایا:

”أُفْلِحْتُ يَا فَدَيْمُ إِنْ مِتُّ وَلَمْ تَكُنْ أَمِيرًا وَلَا كَاتِبًا وَلَا عَرِيفًا“^(۹۱) ”اے مقدم! تو نے نجات پائی، اگر تو اس حال میں فوت ہوا کہ تو نہ لوگوں کا امیر ہو، نہ منشی اور نہ عریف۔“

ایک اور روایت جو ابوداؤد میں ہے کہ کسی نے نبی کریم ﷺ سے درخواست کی کہ ”اے اس کے باپ کے بعد جو کہ اب بوڑھا ہو چکا ہے، ایک چشمے کا عریف بنا دیا جائے۔“ آپ نے فرمایا:

”إِنَّ الْعَرِيفَةَ حَقٌّ وَلَا بَدَ لِلنَّاسِ مِنَ الْعَرِيفَاءِ وَلَكِنَّ الْعَرِيفَاءَ فِي النَّارِ“^(۹۲)

”عرفت بے شک ایک ضروری منصب ہے، اس کے بغیر گزارا نہیں مگر اکثر عریف جہنم میں جائیں گے“

مسند بزاز میں اس سلسلے میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

”إِنَّ فِي النَّارِ حَجَرًا يُقَالُ لَهُ وَيْلٌ لِّیَصْعَدُ عَلَيْهِ الْعَرِيفَاءُ وَيَنْزَلُونَ“^(۹۳)

”جہنم میں ایک پتھر ہے جسے 'ویل' کہا جاتا ہے۔ عرفاء کو اس پر چڑھایا جائے گا اور پھر نیچے پھینکا جائے گا۔“

مسند ابویعلیٰ میں روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ ایک جنازے کے پاس سے گزرے۔ آپ نے فرمایا:

اس جنازے والے کے لئے خوشخبری ہے بشرطیکہ یہ 'عرفیف' نہ ہو۔^(۹۴)

رشوت اور اس کے بارے میں وعید

مالی بدعنوانیوں کی ایک شکل رشوت بھی ہے۔ رشوت کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ جس کام کا معاوضہ لینا شرعاً درست نہ ہو، اس کا معاوضہ وصول کیا جائے۔ مثلاً ایک کام کسی شخص کے فرائض میں داخل ہو اور اسے اس کام کی انجام دہی پر سرکاری طور پر معاوضہ اور تنخواہ ملتی ہو، ایسا کام کرنے پر وہ صاحبِ ضرورت شخص سے کوئی معاوضہ وصول کرے۔^(۹۵) قرآن مجید نے رشوت کے لئے سُحْت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ لفظ

سُحت کا معنی ہلاکت و بربادی ہے۔ رشوت نہ صرف لینے دینے والوں کو اخلاقی اور معاشی طور پر تباہ و برباد کرتی ہے بلکہ ملک و ملت کی جڑ اور امن عامہ کی بنیادیں ہلا دیتی ہے۔ جس ملک میں رشوت کی لعنت چل پڑتی ہے وہاں قانون بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے، لوگ رشوت دے کر ہر کام کروا لیتے ہیں۔ حقدار کا حق مارا جاتا ہے اور غیر حقدار مالک بن بیٹھتے ہیں۔ قانون، جو کہ لوگوں کے حقوق کا ضامن ہوتا ہے بے اثر ہو کر رہ جاتا ہے۔ قانون کی حاکمیت جس معاشرے میں کمزور پڑ جائے وہ معاشرہ زیادہ دیر چل نہیں سکتا، نہ کسی کی جان محفوظ رہتی ہے نہ مال و عزت، قرآن مجید نے اسے سُحت کہہ کر اشد حرام قرار دے دیا ہے۔ رشوت کے دروازے بند کرنے کے لئے اسلام نے یہ اصول دیا ہے کہ اُمراء و حکام کو خفے دینا حرام ہے۔^(۹۶) اس سلسلے میں قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ﴾^(۹۷)

”آپس میں ایک دوسرے کے مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ اور نہ مال کو حاکموں تک پہنچاؤ کہ تم لوگوں کے مال کا کچھ حصہ گناہ کے طریقے سے جانتے بوجھتے کھا جاؤ۔“

قرآن مجید نے یہود کے مذہبی اجارہ دار طبقے کی یہ خرابی بیان کی ہے کہ وہ لوگوں کو ان کی پسند کے فتوے جاری کر کے ان سے رشوت کھاتے ہیں۔ قرآن مجید نے ان لوگوں کا ذکر یوں فرمایا:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ﴾^(۹۸)

نبی کریم ﷺ کی پالیسی بظاہر بڑی سخت نظر آتی ہے لیکن مالیاتی معاملات میں نظم اسی صورت میں پیدا ہو سکتا ہے جب بدعنوانی کا سبب بننے والے ہر چھوٹے سے چھوٹے سوراخ کو بھی مکمل طور پر بند کیا جائے۔ چھوٹے سے چھوٹے سوراخوں سے جب پانی کو رسنے دیا جائے تو یہی سوراخ بڑے ہو کر بند کو اپنے ساتھ بہا کر لے جاتے ہیں۔ چھوٹی چھوٹی بدعنوانیوں سے اگر درگزر کیا جائے تو یہی غلطیاں پورے معاشی ڈھانچے کو زمین بوس کر دیتی ہیں۔ آج کا دور اس کی واضح مثال ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو کچھ نازل فرمایا ہے، یہ لوگ (یہود) اسے چھپاتے ہیں اور اس کے ذریعے معمولی معاوضہ حاصل کرتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان سے قیامت کے دن بات نہیں کرے گا اور نہ انہیں پاک کرے گا۔ یہودیوں کی اس خرابی کو قرآن مجید یوں بھی بیان کرتا ہے

^(۹۹)

﴿سَمْعُونَ لِلْكَذِبِ أَكْلُونَ لِّلْسُحْتِ﴾

”یہ لوگ جھوٹ (افواہیں) بڑے شوق سے سنتے ہیں اور حرام خوری میں بڑے تیز ہیں۔“
نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”لعن رسول اللہ ﷺ الراشی والمرتشی“ (۱۰۰) (آپؐ نے رشوت دینے والے اور رشوت لینے والے پر لعنت فرمائی)

آپؐ نے فرمایا: ”کل لحم نبت بالسحت فالنار أولى به“ (جس گوشت نے سُحت (حرام) سے پرورش پائی، آگ اس کے لئے زیادہ مناسب ہے) پوچھا گیا: سُحت کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ”الرشوة فی الحکم“ (فیصلے صادر کرنے میں رشوت وصول کرنا) (۱۰۱)

اسی طرح کی ایک حدیث مبارکہ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ سے بھی مروی ہے۔
ابن خویز منداد نے سُحت کی ایک شکل یہ بیان کی ہے کہ ایک شخص کا کسی صاحب اختیار شخص کے ساتھ کوئی کام اور حاجت ہو لیکن اس کی صاحب منصب شخص تک رسائی نہ ہو، جبکہ کسی دوسرے شخص کا اس صاحب منصب کے ساتھ تعلق موجود ہو اور وہ سائل کی رسائی متعلقہ افسر تک کروانے کے لئے کوئی فیس اور معاوضہ طلب کرے۔ (۱۰۲)

سُحت اور رشوت کی ایک شکل یہ بھی روایات میں بیان کی گئی ہے کہ کسی صاحب منصب شخص کو کوئی چیز دی جائے تاکہ کسی کا حق مار کر خود حاصل کر لیا جائے۔ اگر کوئی شخص رشوت لے کر کسی کا کام حق کے مطابق کرتا ہے تو وہ شخص رشوت لینے کی وجہ سے گنہگار ہوگا اور یہ مال اس کے لئے سُحت ہوگا۔ لیکن اگر رشوت لے کر حق کے خلاف فیصلہ کیا اور غیر حقدار کو حق دے دیا تو یہ جرم کئی گنا بڑھ جائے گا۔ اس میں رشوت، ظلم، حق تلفی اور اللہ تعالیٰ کی حد کو توڑنا بھی شامل ہو جاتا ہے۔ (۱۰۳)

امام ابوحنیفہؒ کا نقطہ نگاہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص رشوت وصول کرتا ہے تو وہ اسی وقت معزول کر دیا جائے۔ اگر اسے معزول نہ کیا گیا تو اس فعل کے ارتکاب کے فوراً بعد سے اس کے تمام احکام غیر قانونی سمجھے جائیں گے۔ (۱۰۴)

صاحب تفسیر امام قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ رشوت وصول کرنا فسق ہے اور کسی فاسق کے لئے فیصلہ کرنا جائز نہیں۔ (۱۰۵) حدیث شریف میں رشوت کے لینے دینے میں واسطہ بننے والے کو بھی اتنا ہی مجرم قرار دیا گیا ہے جتنا رشوت لینے اور دینے والے کو۔ (۱۰۶)

نبی کریم ﷺ نے ان قرآنی تعلیمات کو عملی شکل دی۔ آج کے دور میں مالی بدعنوانیوں کے انسداد کے لئے یہ واقعہ بڑا بنیادی راہنما ثابت ہو سکتا ہے کہ خیبر کے یہودیوں سے نبی کریم ﷺ نے اس شرط پر مصالحت فرمائی تھی کہ وہ اپنی آدھی زرعی آمدنی مسلمانوں کو ادا کیا کریں گے۔ آپؐ کی طرف سے حضرت

عبداللہ بن رواحہؓ کو حاصل وصول کرنے کے لئے متعین فرمایا گیا۔ ان لوگوں نے اپنی عورتوں کے زیورات بیچ کر تم جمع کی اور صحابی رسول کو پیش کرنا چاہی کہ یہود کا حصہ بڑھا دیا جائے۔ عبداللہ بن رواحہؓ کا جواب نہ صرف یہود کے لئے بلکہ آج کے دور کے لئے روشنی کا مینار ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ”اے یہودیو! اللہ کی قسم تم اللہ کی مخلوق میں سے مبغوض ترین مخلوق ہو لیکن تمہاری یہ رشوت مجھے ظلم پر آمادہ نہیں کر سکتی، تمہاری یہ رشوت حرام ہے ہم مسلمان اسے نہیں کھاتے“۔ یہودیوں نے ان کی تقریر سن کر کہا کہ یہی وہ انصاف ہے جس سے آسمان وزمین قائم ہے۔ (۱۰۷)

بدعنوانی کی ایک شکل یہ ہے کہ حکمران لوگوں کو سرکاری خزانے سے رشوت کے طور پر مال دیں اور اس سے ان کا مقصد یہ ہو کہ سیاسی یا معاشی مقاصد حاصل کریں۔ اس طرح کی بدعنوانی کے انسداد کے لئے نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

”اے لوگو! اگر تمہیں کوئی چیز عطا کریں تو لے لیا کرو جب تک کہ وہ عطا ہی رہے یعنی (یہ عطیہ کسی خدمت اور استحقاق کے طور پر ہو اور اس کی شرعی بنیاد موجود ہو) پھر جب قریش اقتدار کی خاطر ایک دوسرے سے لڑیں اور عطائیں قرض کے بدلے میں ملیں تو ان عطیات کو چھوڑ دیں اور قبول نہ کرو“ (۱۰۸)

آپؐ نے فرمایا: ”جب قریش آپس میں حکومت کے لئے لڑنے لگیں اور رشوت کے طور پر لوگوں کو عطیات دیئے جائیں (اور یہ مستحق لوگوں کو نہ دیئے جاتے ہوں) تو یہ عطیات قبول نہ کرو“ (۱۰۹) آج کے دور میں یہ دونوں طرح کی رشوت موجود ہے۔ سرکاری کارندے قومی خزانے کو اپنی ذاتی دولت سمجھ کر ناجائز طور پر لوگوں کو بھاری رقوم دیتے ہیں۔ آہستہ آہستہ عوام کی بہت بڑی تعداد اخلاقی طور پر دیوالیہ ہوتی جا رہی ہے۔ رشوت نے لوگوں کی اخلاقی حس کو زنگ آلود کر کے ان کے ضمیر کو سلا دیا ہے۔ دوسری طرف عوام میں یہ خیال اب جڑ پکڑ چکا ہے کہ رشوت کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا اور رشوت کے ذریعے ہر ناممکن کام ممکن ہو جاتا ہے۔

ابو امامہؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جو شخص کسی حاکم یا امیر سے کسی کی سفارش کرے اور پھر اس حاکم کو ہدیہ بھیجے اور وہ اس ہدیہ کو قبول کرے تو اس کا یہ فعل ایسا ہے گویا کہ وہ سود کے بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔ (۱۱۰)

مولانا مودودیؒ لکھتے ہیں کہ اسلام کے معاشی نظام میں انتقال دولت کا جواز تین طریقوں سے جائز ہے۔ ان میں وراثت، ہبہ اور محنت و کسب شامل ہیں۔ اس کے علاوہ عطیات بھی انتقال دولت کا ایک ذریعہ ہے۔ لیکن عطیات صرف وہی معتبر ہوتے ہیں جو کسی چیز یا مال کے حقیقی مالک نے شرعی حدود کے

اندر کسی کو ہبہ اور عطیہ دیا ہو۔ اگر عطیہ کسی حکومت کی جانب سے ہو تو وہ اسی صورت میں جائز ہوگا جب وہ کسی صحیح خدمت کے صلے میں یا معاشرے کے مفاد کے لئے حکومتی املاک میں سے جائز اور معروف طریقے پر دیا گیا ہو۔ عطیہ دینے کا حق بھی اسی حکومت کو حاصل ہوگا جو شرعی دستور کے مطابق شوریٰ کے طریقہ کے مطابق چلائی جا رہی ہو اور جس کا محاسبہ کرنے کا حق اور آزادی قوم کو حاصل ہو۔^(۱۱۱)

ملک میں مالی بے قاعدگی بیت المال کو غلط طور پر استعمال کرنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس غلط استعمال کا ایک طریقہ یہ ہے کہ خزانہ غیر مستحق لوگوں کے لئے کھول دیا جائے، اس سے ملکی خزانہ کئی پہلوؤں سے منفی طور پر متاثر ہوتا ہے۔ ایک تو غیر مستحق لوگ ملکی خزانے پر ناروا بوجھ بن جاتے ہیں۔ خزانہ غلط طور پر استعمال ہونے لگتا ہے۔ حق دار محروم رہ جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ لوگوں کو محنت کی بجائے مفت خوری کی عادت پڑ جاتی ہے اور جس ملک کے لوگ محنت سے گریز کرنے لگیں، اس کی معیشت تباہ ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس سلسلے میں شاہ ولی اللہؒ لکھتے ہیں کہ اگر بیت المال سے وہ لوگ وظائف اور مستقل امداد لینا شروع کر دیں جو درحقیقت اس کے مستحق نہیں ہوتے تو یہ لوگ حقداروں کا حق مارنے کے مرتکب بھی ہوتے ہیں اور ملکی خزانہ بھی غلط طور پر استعمال ہونے لگتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اگر اس طرح کی صورت پیدا ہو جائے تو باشندوں کی اکثریت بادشاہ پر انحصار کرنے لگتی ہے اور بیت المال پر بوجھ بن جاتی ہے۔ غیر مستحق لوگ کبھی یہ کہہ کر وظیفہ حاصل کرتے ہیں کہ وہ غازی ہیں اور ملک کے سیاسی راہنما ہیں۔ وہ کبھی یہ کہہ کر وظائف حاصل کرتے ہیں کہ وہ درباری شاعر ہیں اور بادشاہوں کی درباری شاعروں پر عنایات ہوا ہی کرتی ہیں۔ وہ یہ وظائف کبھی یہ کہہ کر حاصل کرتے ہیں کہ وہ صوفی اور درویش ہیں اور خلیفہ اس بات کو معیوب سمجھتا ہے کہ وہ ان لوگوں کے حالات کی تفتیش کرے کہ کیا یہ حقیقت میں ان وظائف کے مستحق ہیں بھی یا نہیں؟..... ان کا معاشی انحصار صرف بادشاہوں کی مصاحبت، ان کی خوشامدی، جی حضوری اور ان کی مدح میں چرب زبانی پر ہوتا ہے اور آخر کار یہ ایک ایسا فن بن جاتا ہے کہ ان کے تمام خیالات اور فکریں اس برے فن پر صرف ہونے لگتی ہیں اور وقت کی تباہی کا باعث بن جاتے ہیں۔^(۱۱۲)

ملکی خزانے کے غلط استعمال کی ایک شکل سربراہ مملکت یا سربراہ حکومت کے مالیاتی اختیارات بھی ہیں۔ ان اختیارات کے تحت سرکاری خزانہ سربراہ کی ذاتی ملکیت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ خصوصی طور پر ایسی مدت جن کا کوئی آڈٹ نہیں ہوتا یا جنہیں آج کی اصطلاح میں (Unforeseen) مدت کہا جاتا ہے۔ ان مدت میں سے عموماً سیاسی رشوتوں کا کام لیا جاتا ہے۔ پاکستان کے سیاسی ماحول میں تو اس

طرز عمل سے عوام بھی آگاہ ہو چکے ہیں کہ سیاسی لوگوں کو ہم نوا بنانے کے لئے کیا کچھ نہیں کیا جاتا۔ یہ بات بالکل بجا ہے کہ قومی اور بین الاقوامی میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دینے والوں کی حوصلہ افزائی ہونی چاہئے تاکہ دوسروں کی بھی حوصلہ افزائی ہو۔ اس سلسلے میں قرن اول سے شواہد ملتے ہیں کہ ملک و ملت کے لئے کارہائے نمایاں سرانجام دینے والوں کی قدر شناسی کی گئی، لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ غیر مستحق لوگوں اور سرکاری افسران کے چہیتوں کو بھاری انعامات و وظائف سے نوازا جائے اور ہزاروں حق دار اور اہل لوگوں کی کسی کو خبر بھی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ یہ انعامات ملکی خزانے پر ناروا بوجھ نہ بن جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ یہ انعامات ملک میں غیر عادلانہ تقسیم دولت کی شکل اختیار نہ کر لیں۔ جن لوگوں پر ملکی خزانہ خرچ کیا جائے، ان کی خدمات ملکی نظریے کے ساتھ مطابقت بھی رکھتی ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ جن شعبوں کو اللہ اور اس کا رسول حرام قرار دیں، جن کے اسناد کے احکام دیئے گئے ہوں، ہم ان شعبوں میں 'خدمات' سرانجام دینے والوں کو انعامات سے نوازیں۔

اس سلسلے میں کچھ عرصہ قبل لاہور ہائی کورٹ میں یہ مسئلہ زیر بحث آیا کہ وزیراعظم پاکستان یا صدر مملکت یا کسی اعلیٰ عہدیدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے خصوصی اختیارات کو کام میں لاتے ہوئے کسی کو پلاٹ یا خصوصی انعامات سے نواز سکے یا نہیں؟ عدالت نے واشگاف الفاظ میں کہا کہ کسی بڑے سے بڑے عہدیدار کو اس بات کا حق حاصل نہیں کہ وہ بیت المال میں تصرف کرے اور اپنی پسند کے لوگوں کو انعامات سے نوازے۔ جن لوگوں کو حکومت نے اونے پونے داموں پلاٹ فروخت کئے تھے، انہیں حکم دیا گیا کہ وہ ان پلاٹوں کی حقیقی قیمت ادا کریں۔ عدالت نے سابق وزراء اعظم اور وزیراعلیٰ کو حکم دیا کہ وہ بیت المال سے رقوم نکلوانے اور سستے داموں پلاٹ فروخت کرنے کے مسئلے کی عدالت میں وضاحت کریں۔ عدالت نے قرار دیا کہ پاکستان بیت المال ایکٹ ۱۹۹۱ء کے تحت بیت المال سے تصرف کے حوالے سے وزیراعظم کے پاس کوئی اختیارات نہیں اور پاکستان بیت المال مینجمنٹ بورڈ اس کے فنڈز کو ایکٹ کے مطابق خرچ کرنے کا مجاز ہے۔ پنجاب ہائی کورٹ کے فاضل جج نے قرار دیا کہ وزارت خزانہ بیت المال سے کوئی بھی رقم وزیراعظم سیکرٹریٹ کو منتقل نہیں کر سکتی۔ عدالت نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ مستحق افراد کی شناخت کے لئے کوئی مناسب منصافانہ اور منظم طریقہ موجود نہیں ہے اور نہ ہی فی کس امداد کے لئے کوئی ضابطہ موجود ہے۔ عدالت کے خیال کے مطابق کسی فرد واحد کو یہ اختیار نہیں دیا جاسکتا کہ وہ اپنی مرضی سے بیت المال میں تصرف کرے۔ بدعنوانی کے اسناد کے لئے عدالت نے کہا کہ کسی بھی فرد کے پاس کوئی صوابدیدی مالیاتی اختیارات نہیں ہونے چاہئیں۔^(۱۱۳)

حوالہ جات : ۷۱۔ مسلم، کتاب الامارۃ، باب غلط تحريم الغلول (اس جگہ اس موضوع کی چار احادیث موجود ہیں)، جلد سوم، صفحہ ۱۴۶۱، حدیث نمبر ۱۸۳۱

۷۲۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی تعظیم الغلول، جلد سوم، صفحہ ۶۸، حدیث نمبر ۲۷۱۱، (المکتبۃ العصریہ، مصر)

۷۳۔ ایضاً، کتاب الجہاد، باب فی الرجل، ینتفع من الغنیمۃ شیئ جلد سوم، صفحہ ۶۷، حدیث نمبر ۲۷۰۸

۷۳-a۔ ترمذی، کتاب السیر، باب ماجاء فی الغلول، حدیث نمبر ۱۵۷۲

۷۴۔ موطا امام مالک، باب ماجاء فی الغلول، جلد اول، صفحہ ۳۴۵

۷۵۔ ایضاً، جلد اول، صفحہ ۳۴۶

۷۶۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب النبی عن الستر علی من غل، ۷۰۳، حدیث ۲۷۱۶، (مکتبۃ عصریہ، مصر)

۷۷۔ کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال (الخیانۃ) جلد سوم، صفحہ ۴۶۸، حدیث نمبر ۷۶۶۶

۷۸۔ ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب عقوبۃ الغال، جلد سوم، صفحہ ۶۹، حدیث نمبر ۲۷۱۳-۲۷۱۵

۷۹۔ ایضاً، حدیث نمبر ۲۷۱۴ ۸۰۔ ایضاً، حدیث نمبر ۲۷۱۵ ۸۱۔ ایضاً،؟

۸۲۔ ایضاً، باب فی الغلول اذا کان یسیرا یترکۃ الامام ولا یحرق رحلہ، حدیث نمبر ۲۷۱۴

۸۳۔ مسلم، کتاب الامارۃ، (حاشیہ مترجم) جلد پنجم، صفحہ ۱۲۳

۸۴۔ ابوداؤد، ابن ماجہ، نسائی اور موطا امام مالک میں اس روایت کا ذکر ہے، آپؐ نے فرمایا: ”إن صاحبکم قد غل فی

سبیل اللہ“ تمہارے ساتھی نے اللہ کے مال میں سے بددیانتی کی ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ یہ بددیانتی صرف حقوق

العباد میں غصب نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کے حقوق میں بھی مداخلت ہے۔ روایت میں یہ بھی ذکر ہے کہ جب اس کا سامان کھولا

گیا تو اس میں یہودیوں کے چند موتی (منکے) اس میں پائے گئے، ابوداؤد، کتاب الجہاد، باب فی تعظیم الغلول، جلد

سوم، صفحہ ۶۸، حدیث نمبر ۲۷۱۰-۲۷۱۱

۸۵۔ ابن قدامہ، المغنی، تحقیق الدكتور عبداللہ بن عبدالحسن ترمذی اور الدكتور عبدالفتاح محمد الحلو، ۵۰۴/۳ ۸۶۔ ؟

۸۷۔ ابوداؤد، کتاب الخراج والامارۃ، باب السعایہ علی الصدقۃ، جلد سوم، صفحہ ۱۳۲، حدیث نمبر ۲۹۳۷

۸۸۔ منذری، الترغیب والترہیب، باب لیستجاب الدعاء من کل أحد ال الزانی والعشار: ۸۷/۲

۸۸-a۔ ایضاً ۸۹۔ ایضاً ۹۰۔ ایضاً ۹۱۔ ابوداؤد، کتاب العرافۃ، حدیث نمبر ۲۹۳۳

۹۲۔ ایضاً، حدیث نمبر ۲۹۳۴ ۹۳۔ الترغیب والترہیب، جلد دوم، صفحہ؟ ۹۴۔ ایضاً

۹۵۔ محمد شفیع مفتی، معارف القرآن، جلد سوم، صفحہ ۱۵۱-۱۵۲ ۹۶۔ جصاص، احکام القرآن

۹۷۔ البقرۃ: ۱۸۸ ۹۸۔ البقرۃ: ۱۷۴ ۹۹۔ المائدۃ: ۴۲

۱۰۰۔ ترمذی، کتاب الاحکام، باب ماجاء فی الراشی والمرتشی فی الحکم، جلد سوم، صفحہ ۳۲۲، حدیث ۱۳۳۶

۱۰۱۔ قرطبی، جامع لاحکام القرآن ۱۰۲۔ ایضاً ۱۰۳۔ ایضاً ۱۰۴۔ ایضاً ۱۰۵۔ ایضاً

۱۰۶۔ کنز العمال، جلد پنجم، صفحہ ۸۲۵، حدیث نمبر ۱۴۴۹۵ ۱۰۷۔ موطا امام مالک، کتاب المساقات، جلد اول، صفحہ ۵۱۶

۱۰۸۔ ابوداؤد، کتاب الخراج والامارۃ، باب فی کراہیۃ الافتراض فی آخر الزمان، جلد سوم،

صفحہ ۱۳۷، حدیث نمبر ۲۹۵۹، (المکتبۃ العصریہ، بیروت) ۱۰۹۔ ایضاً

۱۱۰۔ ابوداؤد، کتاب البیوع، باب فی الہدیۃ لقضاء الحاجۃ، جلد دوم، صفحہ ۲۹۱، حدیث نمبر ۳۵۴۱

۱۱۱۔ مودودیؒ، مولانا اسلامی ریاست، صفحہ ۶۱۵، ۶۱۶ ۱۱۲۔ شاہ ولی اللہ، حجۃ اللہ البالغہ

شیخ عبداللہ بن محمد المختار مترجم: ڈاکٹر عبدالوہاب صدیقی
حاشیہ میں شائع تحریر: پروفیسر اختر حسین عزمی، پتوکی

انسان کی طبعی کمزوریاں..... قرآن کریم میں

مادیت کے اس دور میں انسان کے وجود پر مادی حوالے سے بہت کچھ لکھا جا رہا ہے لیکن 'انسان' پر روحانی پہلو سے توجہ نہیں دی جا رہی، نہ اس ضمن میں وحی الہی سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان مادی طور پر کسی حد تک مطمئن ہو جانے کے باوجود روحانی حوالے سے بہت کھوکھلا اور تشنہ ہے۔

زیر نظر مضمون میں اس پہلو سے لکھے گئے دو مضامین کو بیک مقام شائع کیا جا رہا ہے جس میں دو فاضل حضرات نے ایک ہی موضوع پر اپنے اپنے ذوق اور معلومات کے مطابق روشنی ڈالی ہے۔ قرآن کریم میں انسان کی طبعی اور نفسیاتی کمزوریوں اور صفات کو مختلف انداز پر پیش کیا گیا ہے، یہ دونوں مضامین اسی کا مطالعہ ہیں۔ پروفیسر اختر حسین عزمی کا تحریر کردہ حاشیہ میں شائع ہونے والا مضمون محدث کو موصول ہوا تھا، انہی دنوں سعودی عرب کی فاضل شخصیت شیخ عبداللہ معتاز کی بھی اسی موضوع پر تفصیلی تحریر پڑھنے کو ملی، حاشیہ میں شائع کردہ تحریر اگر اس موضوع کا فلسفیانہ اور تفکرانہ تجزیہ پیش کرتی ہے تو متن کی جگہ پر شائع کردہ تحریر میں قرآن کریم کی آیات سے جا بجا استشہاد کیا گیا ہے اور اس میں 'نقطی' انداز و استدلال غالب ہے، اس حوالے سے دونوں مضامین ایک دوسرے کی تکمیل بھی ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر بیک وقت انہیں شائع کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین ایک کامل بحث سے استفادہ کر سکیں۔ (حسن مدنی)

اس مضمون میں ہم قرآن مجید سے انسان کی اُن پندرہ صفات اور کمزوریوں کا ذکر کریں گے جو انسانوں میں عام طور پر پائی جاتی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ جس شخص کو اپنے احکام کی پیروی اور اپنے رسول کی

انسانی فطرت میں چند ایسی کمزوریاں پنہاں ہیں جن کا ادراک کئے بغیر نہ تو اس کی انفرادی شخصیت کی صحیح تعمیر ممکن ہے اور نہ ہی اجتماعی اصلاح و تربیت اور نفوسِ انسانی کے تزکیہ کی کٹھن منزل سر کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ انسان اپنی ذہنی و عقلی قوتوں کی بنیاد پر اس کائنات میں جتنا سر بلند ہے، اتنا ہی اپنی خلقت و فطرت میں موجود کمزوریوں کی وجہ سے ضعیف و ناتواں بھی ہے ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾

قرآن کریم میں انسانی طبیعت کی ان کمزوریوں کا جا بجا ذکر ملتا ہے جن کے متعلق یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ اگر انسان اپنی ان خلقی حالتوں پر غور کرتا رہے تو اس کی بہت سی معاشرتی کوتاہیوں اور عبادت و بندگی سے متعلق غفلت و جہالت کا علاج ممکن ہے۔ فطرتِ انسانی کی یہی کمزوریاں ہیں جو برائیوں کا سرچشمہ، گناہوں کی جڑ اور بدکاری کی بنیاد ہیں۔ لیکن چونکہ رب کائنات کی رحمت ہر شے پر محیط ہے: ﴿وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ﴾ (الاعراف ۸: ۱۵۶)..... اور وہ کسی نفس کو بھی اس کی وسعت سے زیادہ تکلیف نہ دے گا: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا﴾ (البقرہ ۲: ۲۸۶) اس لئے فطرت

سیرت سے ہدایت کی توفیق دے اور اس کے نفس کی تادیب و تعلیم اور تہذیب کے ذریعے سے حفاظت فرمائے۔ وہ ان خامیوں اور کوتاہیوں سے محفوظ رہتا ہے:

پہلی صفت..... کمزوری

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾ (النساء ۲۸/۴) ”انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے“

نیز ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلْيَنْظُرِ الْإِنْسَانُ مِمَّ خُلِقَ، خُلِقَ مِنْ مَّاءٍ دَافِقٍ، يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَائِبِ،

إِنَّهُ عَلَى رَجْعِهِ لَقَادِرٌ، يَوْمَ تُبْلَى السَّرَائِرُ، فَمَا لَهُ مِنْ قُوَّةٍ وَلَا نَاصِرٍ﴾

”انسان دیکھے کہ کس چیز سے پیدا کیا گیا؟ اُچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا جو پشت اور سینوں کے

درمیان سے نکلتا ہے، بے شک وہ اسے دوبارہ پیدا کر سکتا ہے، جس دن راز کھولے جائیں گے،

اس دن اس کا کوئی زور اور کوئی مددگار نہ ہوگا“ (الطارق ۱۰۳/۸۶)

بے شک انسان اتنا کمزور ہے کہ اپنے نفع و نقصان اور موت و حیات اور دوبارہ زندہ ہونے کا مالک نہیں۔ اور اگر اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو اپنے ارد گرد خوفناک قوتوں اور زبردست خطرات یعنی جانوروں، زہریلے کیڑوں کھڑوں اور ان مخلوقات کے ساتھ جنہیں اللہ ہی جانتا ہے وہ اس روئے زمین پر زندہ نہ رہ سکتا..... یقیناً یہ انسان جو مخلوق ”منیٰ“ سے پیدا ہوا ہے، اتنا کمزور ہے کہ اگر اس کے بدن میں کاٹنا چھب جائے یا ذرا سا زخم ہو جائے تو رات بھر سو نہیں سکتا۔ اگر اس پر اللہ کا کوئی ہلکا سا عذاب بھی نازل ہو جائے تو اسے سکون و قرار اور جمع خاطر نصیب نہ ہو..... یہ جسمانی حیثیت میں بھی سب سے کمزور ہے۔ اگر جراثیم جو آنکھ سے دکھائی نہیں دیتے، اس پر غالب آجائیں تو اس کی طاقت برباد کر دیں اور اگر مکھی اس سے کوئی چیز چھین لے تو واپس نہ لے سکے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں:

﴿وَإِنْ يَسْلُبْنَهُمُ الذُّبَابُ شَيْئًا لَا يَسْتَنْفِذُوهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ﴾

”اور اگر ان سے مکھی کوئی چیز چھین لے تو اس سے چھڑا (نکال) نہ سکیں، طالب (انسان)

اور مطلوب (مکھی) دونوں کمزور ہیں“ (الحج ۷۳/۲۲)

کسی شاعر نے کہا ہے۔

نسی الطین ساعة أنه طين حقير فصال تيهًا و عربدا

و كُسى الخَرَّ جسمه فتباهى وحوى المال كيسه فتمردا

أنت مثلي يهش وجهك للنعمى وفي حالة المصيبة يكند

”خاک نے جب فراموش کر دیا کہ وہ حقیر خاک ہے تو شرارت اور تکبر کرنے لگی،.....“ اور اس کے

بدن کو ریشم پہنایا گیا تو فخر کرنے لگی اور اس کی جیب میں مال آ گیا تو سرکش ہونے لگی،.....“ تو مجھ

جیسی ہے جس کے چہرے کو نعمت شاداں کر دیتی ہے اور مصیبت کی حالت میں جھونپٹا ہو جاتا ہے“

دوسری صفت نا اُمیدی، خوشی، فخر اور اسراف

اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں

﴿وَلَيْكُنْ أَذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَكَفُورٌ وَكَافِرٌ ۖ وَلَئِنْ أَذَقْنَاهُ نَعْمَاءَ بَعْدَ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحَ فَخُورٌ﴾ (ہود: ۱۰، ۹/۱۱)

”جب ہم انسان کو اپنی کوئی رحمت چکھاتے ہیں پھر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ نا اُمید، ناشکرا ہو جاتا ہے اور جب ہم اسے پریشانی کے بعد نعمت چکھاتے ہیں تو وہ ضرور کہتا ہے کہ میری پریشانیاں دور ہو گئیں اور اترانے اور فخر کرنے لگتا ہے“ اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْبِهِ أَوْ قَاعِدًا أَوْ قَائِمًا فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُ ضُرَّهُ مَرَّ كَأَن لَّمْ يَذْعُرْنَا إِلَىٰ ضُرِّ مَسَّهُ كَذَلِكَ زِينٌ لِّلْمُسْرِفِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾ (یونس: ۱۲۱)

”اور جب انسان کو تکلیف پہنچتی ہے تو لیٹے، بیٹھے اور کھڑے (ہر حالت میں) ہم کو پکارتا ہے اور جب ہم اس کی تکلیف دور کر دیتے ہیں تو ایسے گزر جاتا ہے جیسے ہمیں کسی تکلیف میں پکارا ہی نہ ہو، ایسے ہی اسراف پسندوں کے عمل ان کے لئے خوشمنا بنا دیئے جاتے ہیں“ اور ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤُوسًا﴾ (الاسراء: ۸۳/۸۴)

انسانی کی یہی کمزوری اپنی دوسری حیثیت میں انسان کے لئے پیغامِ رحمت، نویدِ مغفرت اور آیتِ تخفیف بن گئی: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ أَن يَخَفِّفَ عَنْكُمْ وَخُلِقَ الْإِنْسَانُ ضَعِيفًا﴾ (النساء: ۲۸)

”اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے بوجھ کو ہلکا کر دے کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے“

(۱) مایوسی

انسان دنیا میں اپنی کامیابی کے منصوبے بناتا ہے، دوسروں سے توقعات وابستہ کرتا ہے، خواہشات کے محل کھڑے کرتا ہے لیکن حقائق کی تلخیوں سے ٹکرا کر اس کی یہ خواہشات و توقعات اور منصوبے ٹکست و ریخت کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس ناکامی میں کہیں تو اس کی فطری جبلت پسندی اور جلد بازی کا ہاتھ ہوتا ہے تو کہیں وسائل اور حالات کے ادراک سے عاری منصوبہ بندی کا کردار۔ اپنی ناکامی میں اپنی عملی کوتاہیوں کا مبنی بر حقیقت تجزیہ کرنے کی بجائے وہ مایوسی کے گڑھے میں جا گرتا ہے: ﴿وَلَنْ تُصْبِحَهُمْ سَيِّئَةً بِمَا قَدَّمْتَ إِلَيْهِمْ إِذَا هُمْ يَقْنَطُونَ﴾ (الروم: ۳۰، ۳۱) ”اور جب ان کے اپنے کئے کرتوتوں سے ان پر مصیبت آتی ہے تو یکا یک وہ مایوس ہونے لگتے ہیں“۔

انسان چونکہ تھڑولا پیدا کیا گیا: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا﴾ اس لئے نعمت کے ملنے پر تو اٹھلاتا پھرتا ہے لیکن جب اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو جلد ہی مایوس ہو جاتا ہے: ﴿وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ كَانَ يَؤُوسًا﴾ (الاسراء: ۸۳، ۸۴) انسان کی اسی سرشت کی طرف اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے مقام پر اشارہ فرمایا:

﴿وَلَنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ فَيَؤُوسٌ قَنُوطٌ﴾ (فصلت: ۴۱، ۴۲)

”اور جب کوئی آفت اس پر آ جاتی ہے تو وہ مایوس اور دل شکستہ ہو جاتا ہے“

”اور جب اسے پریشانی ہو تو مایوس ہو جاتا ہے“ اور فرمایا:

﴿وَإِذَا أَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً فَرِحُوا بِهَا وَإِنْ تُصِيبُهُمْ سَيِّئَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ إِذَاهُمْ يَقْنَطُونَ﴾ (الروم: ۳۰/۳۶)

”اور ہم انسان کو اپنی کوئی رحمت چکھاتے ہیں تو اس کی وجہ سے اترانے لگتا ہے اور اگر اپنے کرتوت کی وجہ سے اسے ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے تو یکا یک ناامید ہو جاتا ہے“

اللہ تعالیٰ کا یہ بھی ارشاد ہے: ﴿وَإِذَا مَسَّ النَّاسُ ضُرٌّ دَعَوْا رَبَّهُمْ مُنِيبِينَ إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا آذَاهُمْ مِنْهُ رَحْمَةٌ إِذَا فَرِيقٌ مِنْهُمْ بِرَبِّهِمْ يُشْرِكُونَ﴾ (الروم: ۳۰/۳۳)

”اور جب انسانوں کو کوئی تکلیف ہوتی ہے تو اللہ کی طرف توجہ دے کر پکارتے ہیں اور جب وہ انہیں کوئی رحمت چکھا دیتا ہے تو یکا یک ان کا ایک گروہ اپنے رب کے ساتھ شرک کرنے لگتا ہے“

اکثر اوقات انسان پل بھر میں ناامید ہو جاتا ہے اور محض نعمت کے چھن جانے سے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کرتا ہے اور آسائش کی حالت میں اترتا ہے۔ کسی مشکل کو برداشت نہیں کر پاتا۔ نہ کسی تکلیف پر صبر کرتا ہے اور نہ اس کے دور ہونے کی اُمید رکھتا ہے۔ جب اللہ اسے نعمت دیتا ہے تو اس کے زوال کے بارے میں نہیں سوچتا اور مغرور بن کر اکرٹتا ہے۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جنہوں نے اپنے نفس کی تربیت صبر اور نیک اعمال پر کی ہے اور مشکلات کو برداشت کیا اور اللہ کی عطا کی ہوئی نعمت کا شکریہ ادا کیا ہے۔

انسان کی عام صفت جیسا کہ بیان کیا گیا ہے: تکلیف پر ناامیدی، نعمتوں کی ناشکری اور راحت اور آرام ملنے پر خوش ہونا، تکبر کرنا، شرارت و اسراف اور ہر چیز میں حدود سے تجاوز کرنا ہے۔ جبکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اپنے نفس کی تربیت ایسے کریں کہ نہ بہت خوش ہوں نہ بے حد ناامید۔ اللہ کا فرمان ہے:

﴿مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي أَنْفُسِكُمْ إِلَّا فِي كِتَابٍ مِنْ قَبْلِ أَنْ نَبْرَأَهَا، إِنَّ ذَلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرٌ، لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلَى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَا آتَاكُمْ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ﴾ (الحديد: ۲۲/۲۳)

”جو بھی مصیبت زمین یا تمہارے اوپر سے آتی ہے وہ زمین کے پیدا ہونے سے پہلے ایک کتاب میں محفوظ ہے بے شک یہ اللہ پر آسان ہے تاکہ تم سے جو چیز چھن جائے اس پر افسوس نہ کرو اور جو (چیز) تمہیں دے اس پر اتر او نہیں اور اللہ خود پسند مغرور کو قطعاً پسند نہیں فرماتے“

تیسری صفت ظلم و ناشکری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾ (ابراہیم: ۱۴/۳۴) ”بے شک انسان بڑا ظالم ناشکرا ہے“

اور فرمایا:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُبِينٌ﴾ (الزحرف: ۴۳/۱۵) ”بے شک انسان کھلم کھلا ناشکرا ہے“

اور اس کا ارشاد ہے:

﴿قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ﴾ (عبس: ۸۰/۱۷) ”انسان ہلاک ہو وہ کتنا ناشکرا ہے“

لہذا کفر اور ظلم انسان کی پائیدار صفت ہے اور جب تک اللہ تعالیٰ اسے ہدایت کی توفیق نہیں دیتا وہ اللہ کی نعمتوں کی ناشکری اور وہ اس وقت تک اپنے اور دوسروں پر ظلم کرتا رہتا ہے جب تک اپنے نفس کو اسلام کے احکامات اور محاسن پر درست نہ کر لے۔

انسان جب خود کو مالدار اور طاقتور دیکھتا ہے تو دوسروں پر ظلم و زیادتی کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ظلم کرنا اس کی پائیدار صفت بتائی گئی ہے اور اسی لئے نماز میں اللہ تعالیٰ سے یہ دعا کی جاتی ہے:

اللَّهُمَّ إِنِّي ظَلَمْتُ نَفْسِي ظُلْمًا كَثِيرًا، وَلَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ فَاعْفِرْ لِي مَغْفِرَةً مِنْ عِنْدِكَ وَارْحَمْنِي إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ (صحیح بخاری: ۱۱۵۱)

”اے اللہ! میں نے اپنے اوپر بہت ظلم کیا اور گناہوں کو آپ ہی بخشتے ہیں، آپ اپنی طرف سے مجھے بخش دیں اور مجھ پر رحم کریں آپ غفور رحیم ہیں“

اور زیادہ تر لوگ اپنے رب کے نافرمان اور اس کے دین سے بیزار ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنْ تَطْعُ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يَضْلُوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ﴾ (الانعام: ۱۱۶/۶)

”اور اگر آپ روئے زمین کے زیادہ تر لوگوں کے پیچھے چلیں گے تو وہ آپ کو اللہ کے راستے سے دور کر دیں گے، وہ تو اندازے ہی کے پیچھے چلتے اور قیاس آرائی کرتے ہیں“

فرمان الہی ہے: ﴿وَمَا أَكْثَرُ النَّاسِ وَلَوْ حَرَصْتَ بِمُؤْمِنِينَ﴾ (یوسف: ۱۰۳/۱۲)

”اور زیادہ تر لوگ آپ چاہیں تو بھی مؤمن نہیں ہوں گے“

(۲) ناشکری

انسانی طبیعت اظہارِ استغناء کے لئے تمول کی خواہشمند اور دولت و ثروت کی طلب گار ہے۔ اس کی لامتناہی طلب کا پیٹ سونے کی وادیاں بھی نہیں بھر سکتیں۔ اس لئے سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود انسان خدا کا ناشکرا ہی رہتا ہے: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾ (العدايات ۱۰۰: ۸، ۷، ۶) ”بے شک انسان اپنے پروردگار کا ناشکر گزار اور خود اس پر گواہ ہے اور وہ مال کا سب سے زیادہ چاہنے والا ہے“

انسان میں یہ ناشکری کبھی تو حالات سے مایوسی و ناامیدی کے بعد پیدا ہوتی ہے ﴿إِنَّهُ لَيَنفُسٌ كَفُورٌ﴾ (ہود: ۱۱/۹) ”بے شک وہ مایوس اور ناشکرا ہے“..... اور کبھی مصائب و آلام سے آزادی کے بعد خوشحالی بھی اسے خدا کا ناشکرا بنا دیتی ہے۔ جب کشتی گرداب میں چکراتی ہے تو حالتِ اضطراب میں اللہ کے سامنے ہاتھ اٹھ جاتے ہیں لیکن ﴿فَلَمَّا نَجَّكُمْ إِلَى الْبَرِّ أَعْرَضْتُمْ وَكَانَ الْإِنْسَانُ كَفُورًا﴾ (الاسراء: ۱۷/۶۷) ”پھر جب تمہیں خشکی کی طرف نجات دے دی تو تم اعراض کرنے لگے، کیونکہ انسان ہے ہی ناشکرا!“

صحیح مومنوں کی تعداد کافروں کی نسبت سیاہ بیل کے بدن پر سفید بال کی طرح ہے اور یہ بات حدیث میں وارد ہے۔ اور یہ بھی کہ جہنم کا لشکر ہر ہزار میں نو سو ننانوے ہوگا۔ ہم اللہ سے سچائی اور ہدایت پر ثابت قدم رہنے کی دعا کرتے ہیں۔

چوتھی صفت..... لڑائی اور تکرار

اللہ کا ارشاد ہے: ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ﴾ (النحل: ۴/۱۶)

”انسان نطفے سے پیدا کیا گیا، پھر ایک ایک جھگڑا لو بن بیٹھا“

اور اس کا ارشاد ہے: ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الکہف: ۵۴/۱۸)

”اور انسان سب سے بڑھ کر جھگڑا لو ہے“

بے شک یہ حقیر نطفے سے پیدا کی گئی مخلوق اپنی فطرت کو بدل لیتی ہے اور جھگڑا لو بن جاتی ہے۔ اپنے اس رب سے جھگڑتی ہے جس نے اسے عدم سے وجود بخشا۔ اس میں جان پیدا کی اور اس کے کان، آنکھ اور دل بنائے، وہ بلا وجہ اللہ کے وجود الوہیت کے بارے میں جھگڑتا ہے۔ یہ ہے کون کہ علم و ہدایت اور روشن کتاب سے ہدایت حاصل نہ کرے اور اللہ کے بارے میں جھگڑے۔

انسان! جیسا کہ علیم و خیر نے بیان کیا ہے، سب سے زیادہ جھگڑا لو ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بہت سی مخلوقات پیدا کی ہیں اور وہ سب اس سے کم جھگڑا لو ہیں اور یہ بڑی باعثِ شرم بات ہے۔ اس لئے انسان کو اپنے غرور و تکبر سے باز آنا چاہئے..... اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے مثالیں بیان کیں، لیکن وہ سچائی کے ظاہر ہو جانے کے باوجود اس کے بارے میں جھگڑتے ہیں۔ اگر انسان اس بدترین اخلاقی بیماری کا علاج نہ کرے اور شفا بخش دوا سے اس کا ازالہ نہ کرے تو یہ کتنی بری بیماری ہے!!

لڑائی اور جھگڑا منافقوں کی خصوصیت ہے۔ وہ اپنے جھگڑوں میں بدزبانی کرتے ہیں اور حدیث میں انکی یہ صفت آئی ہے کہ ”إِذَا خَاصَمَ فَجَرَ“ ”جب جھگڑتا ہے تو بدزبانی کرتا ہے“، لیکن مسلمان کیلئے تو

(۳) جھگڑا لو پن

انسان جس چیز کو اچھا اور بہتر سمجھتا ہے، اس کا چلن اور غلبہ ہر جگہ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس کے لئے وہ تعلیم و تبلیغ سے لے کر قوت و سطوت کے ہر ہتھیار کو آزماتا ہے۔ اس کی پسند و ناپسند کے برعکس دوسری طرف سے اس کو تعاون کی بجائے اکثر مخالفت کا سامنا ہوتا ہے۔ اس کشاکش کا لازمی نتیجہ ہے کہ انسان مقابلہ و مجادلہ کے لئے تیار رہے۔ مقابلہ بازی کے بطن سے ضد، ہٹ دھرمی اور عصیت بے جا کے رذائل پیدا ہوتے ہیں حتیٰ کہ جب کبھی اس کے سامنے کوئی بھلی اور نیک بات بھی پیش کی جاتی ہے تو وہ جدال و نزاع کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ ﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ أَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا﴾ (الکہف: ۵۴/۱۸) ”انسان بڑا ہی جھگڑا لو واقع ہوا ہے“ ایک دوسرے مقام پر ارشادِ خداوندی ہے ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ نُطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُبِينٌ﴾ (النحل: ۴/۱۶)

یہ ضروری ہے کہ مخالفوں سے بحث و تکرار بھی کرے تو اچھائی کے ساتھ اور لہجہ مناسب ہے، ارشاد ہے:

﴿أَدْعُ إِلَى سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحُكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ﴾
 ”اپنے رب کی طرف حکمت اور بہتر نصیحت کے ذریعہ دعوت دو اور ایسے انداز سے جھگڑو جو بہترین ہو“ (النحل: ۱۲/۱۲۵)

پانچویں صفت..... عجلت و جلد بازی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا﴾ (الاسراء: ۱۱/۱۷) ”اور انسان بہت جلد باز ہے“

نیز اس کا ارشاد ہے:

﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَأُورِيكُمْ آيَاتِي فَلَا تَسْتَعْجِلُون﴾ (الانبياء: ۲۱/۳۷)

”انسان جلد بازی سے پیدا کیا گیا ہے، میں تمہیں اپنی نشانیاں دکھاؤں گا لہذا مجھ سے جلد بازی نہ کرو“

بے شک انسان بہت جلد باز ہے۔ وہ کاموں کے انجام کو نہیں جانتا۔ کبھی برائی کے لئے جلد بازی کرتا ہے اور نادانی سے اپنا ہی برا کر ڈالتا ہے۔ وہ اپنے سرکش نفس کو لگام نہیں دے پاتا اور اپنی خواہش نفس کے لئے جلد بازی کرتا ہے۔ لیکن مومن پرسکون و مطمئن رہتا ہے اور اپنے رب پر بھروسہ کرتا ہے۔ بلاشبہ بردباری اور طبیعت کا ٹھہراؤ شرفاء کی صفت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بنو تمیم کے سردار سے فرمایا:

”تمہارے اندر دو ایسی عادتیں ہیں جن کو اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے: بردباری اور اطمینان“
 (بروایت مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور احمد)

(۴) عجلت

انسانی سرشت میں جلد بازی کا عنصر شامل ہے۔ کوئی بھی اعلیٰ مقصد ایک طرف قربانیوں کا طالب ہوتا ہے تو دوسری طرف حصول مقصد کے لئے رفتار کار کے مطابق مدت بھی درکار ہوتی ہے۔ اس کے برعکس انسان اپنی جدوجہد اور عمل کے نتائج جلد دیکھنا چاہتا ہے: ﴿كَلَّا بَلْ تُحِبُّونَ الْعَاجِلَةَ﴾ (القیامہ ۲۰: ۷۵) اس کی وجہ یہ ہے کہ عجلت انسان کے خمیر میں شامل ہے ﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ (الانبياء: ۲۱/۳۷) انسان اپنی اس عجلت پسندی کی وجہ سے خیر و بھلائی اور نفع اندوزی کے لئے ہی جلد بازی نہیں بلکہ اپنی پست ہمتی، بے صبری اور زور پسندی کی وجہ سے بعض اوقات اپنے لیے ناگہانی آفت یا اتفاقی موت تک کی دعائیں بھی مانگنا شروع کر دیتا ہے: ﴿وَيَدْعُ الْإِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَاءَهُ بِالْخَيْرِ﴾ وَكَانَ الْإِنْسَانُ عَجُولًا (الاسراء: ۱۱/۱۷) ”انسان اپنی بھلائی کی طرح اپنی برائی کے لئے بھی دعا کرنے لگتا ہے کیونکہ انسان جلد باز ہے“..... جس طرح نیکی کے پرچارک اپنی نیکی کے نتائج فوری دیکھنے کے متمنی ہوتے ہیں، اسی طرح منکرین حق بھی اپنی طاقت کی بدمستی میں عذاب الہی کے نزول کے لئے جلدی مچا رہے ہوتے ہیں: ﴿وَيَسْتَعْجِلُونَكَ بِالْعَذَابِ﴾ (التكوير: ۲۹/۵۳)

لہذا بردباری اور ثبات ان عقلمندوں کی صفت ہوتی ہے جن کی عقل میں ایسے تمام امور کو سلجھانے کی صلاحیت ہوتی ہے جن میں کم عقل صبر نہیں کر پاتا۔ وہ نتیجے کا انتظار نہیں کرتا کیونکہ اس کا دل بڑے کاموں کو برداشت نہیں کرتا اور نہ کسی بات پر صبر کر پاتا ہے۔ بہت جلد بھڑک اٹھتا ہے اور وقت سے پہلے نتیجے کے لئے جلد بازی کرتا ہے۔

چھٹی صفت..... بخل و کنجوسی

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿قُلْ لَوْ أَنُّكُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذَا لَأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنْفَاقِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَنُورًا﴾ (الاسراء: ۱۰۷/۱۰۸)

”آپ فرمادیں کہ اگر میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہو جاؤ تو خرچ ہو جانے کے خوف سے اسے روک رکھو گے اور انسان بڑا کنجوس ہے“

بیشک اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت اور اس کا بڑا فضل اور آسمان و زمین کی بادشاہت اور دولت کے خزانے اگر اس انسان کے ہاتھ میں آجائیں تب بھی وہ کنجوسی کرے گا۔ اسے خدشہ لاحق رہے گا کہ کہیں صرف نہ ہو جائیں۔ وہ ہوس کی وجہ سے انہیں دبا کر رکھے گا۔ انسان کنجوس و بخیل ہے لیکن جس نے اپنے

(۵) بخل

رفاہ عامہ، صلہ رحمی، شخصی احسان اور انفاق فی سبیل اللہ کی مدات میں انسان خرچ کرتے ہوئے دل میں تنگی محسوس کرتا ہے جبکہ بخل اور کنجوسی کی کتنی ہی شکلیں ہیں جو سخاوت و اسراف کی حالت میں بھی پوشیدہ رہتی ہیں۔ دل ایک قسم کی بے چینی و کرب میں مبتلا رہتا ہے۔ ان سب سے بالاتر فکر فردا سے بری طرح ستاتی ہے۔ وہ سیم و زر رکھتے ہوئے بھی افلاس و تنگدستی سے ڈرتا رہتا ہے۔ ایک بندہ مومن بھی یہ جاننے کے باوجود کہ تنگدستی کا ڈر او شیطاں کی طرف سے ہے ﴿الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ﴾ جبکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل کا وعدہ بھی کیا ﴿وَاللَّهُ يَعِدُكُم مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا﴾ اور باوجود ہر قسم کی کثرت و ثروت کے، خرچ کرتے وقت مال کے ہاتھ سے نکل جانے کا کم سے کم ایک ہلکا سا رنج ضرور محسوس کرتا ہے ﴿قُلْ لَوْ أَنُّكُمْ تَمْلِكُونَ خَزَائِنَ رَحْمَةِ رَبِّي إِذَا لَأَمْسَكْتُمْ خَشْيَةَ الْإِنْفَاقِ وَكَانَ الْإِنْسَانُ قَنُورًا﴾ (الاسراء: ۱۰۷/۱۰۸) ”کہہ دیجئے کہ اگر تم لوگ میرے رب کی رحمت کے خزانوں کے مالک بھی بنا دیئے جاؤ تو بھی خرچ ہو جانے کے ڈر سے بخل کرو گے اور انسان بڑا ہی بخیل اور کم خرچ ہے“..... اسی بخل و کنجوسی کی بڑی وجہ انسان کی حب مال ہے جو انسان کے اندر ایک طاقتور جذبہ ہے ﴿وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ﴾ اس کا اظہار صحابہ کرامؓ جیسی عظیم المرتبت شخصیات سے بھی کبھی جنگ احد میں حضور کی نافرمانی کی صورت میں ہوتا ہے تو کبھی جنگ حنین کے مال غنیمت کی تقسیم پر حضورؐ کے بارے میں بھی بدگمانی کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

فضل کی سخاوت، ہمدردی اور خیر خواہی پر تربیت پائی ہو اور اس کی عادت بنائی ہو وہ بخل و کنجوسی جیسی عادات اور خصائل سے محفوظ رہتا ہے۔ سخاوت، حسن سلوک اور ہمدردی اللہ کی محبوب صفات ہیں اور یہ اسی کے اوصاف ہیں۔ وہ اہل سخاوت کو دوست رکھتا اور بخل کو چھوڑ دینے کی دعوت دیتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ يَبْخُلُونَ وَيَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾

”جو (خود بھی) بخل کرتے اور دوسروں کو (بھی) بخل کا حکم دیتے ہیں اور جو کوئی پیٹھ پھیرے گا تو بیشک اللہ بے نیاز اور حمد و ثنا کا حقدار ہے“ (الحمدید: ۲۴۵)

لہذا اتنی اللہ کا اور لوگوں کا پیارا ہے اور بخیل اللہ کے نزدیک اور لوگوں کے نزدیک ناپسندیدہ شخص ہے۔

ساتویں صفت جہالت و نادانی

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا وَأَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ (الاحزاب: ۷۲)

”ہم نے امانت آسمانوں، زمین اور پہاڑوں پر پیش کی تو انہوں نے اسے اٹھانے سے انکار کر دیا اور ڈر گئے اور انسان نے اسے اٹھالیا، بیشک وہ بڑا ظالم نادان ہے“

یہ ایک اہم ذمہ داری ہے جسے انسان نے اپنے شانوں پر اٹھالیا ہے۔ یہ ایسی امانت ہے جسے اٹھانے سے آسمان و زمین اور پہاڑ ڈر گئے اور اسے انجام دینے سے انکار کر دیا۔ لیکن کمزور، نادان، کم علم، کم فہم، کوتاہ قد اور جذبات و خواہشات اور حرص و ہوس سے بھرپور انسان نے یہ خطرہ مول لیا اور اس بھاری اور اہم ذمہ داری کو اپنے کمزور کندھے پر اٹھالیا۔

اس نے اپنے اوپر ظلم کر لیا اور اپنی سکت اور طاقت کے بارے میں جہالت اور کم علمی کا شکار رہا۔ خود ہی یہ بھاری ذمہ داری اپنے ارادہ اور رضا و رغبت سے اٹھالی۔ اب اگر اسے پوری کرے اور اس کے واجبات ادا کرے، تو عزت افزائی اور ہمیشہ کی نعمتوں کا اہل ہوگا۔ لیکن اگر اپنی ذمہ داری کو ادا کرنے سے کوتاہی کرے اور امانت کے واجبات پورے نہ کرے تو اس کے لئے دردناک عذاب کی وجہ سے ہلاکت ہے اور یہ ہلاکت آسمانوں اور زمین کے زبردست مالک کے غضب کی وجہ سے ہے کیونکہ اس نے اس

(۶) ظلم و جہالت

انسان فطرۃً سادہ اور بے باک ہے۔ سادگی اسے ہر خوشنما اور دلفریب صورت کا شیفہ بنا دیتی ہے اور بے باکی اسے خطرات میں گھیر دیتی ہے۔ اس کی سادگی نے اسے عقل کے جال میں پھنسا دیا اور اس کی بے باکیوں نے اسے زمین پر پٹخ دیا۔ یہ اس کی بے باکی و نادانی ہی ہے کہ جس بار کو آسمان و زمین نے اٹھانے سے انکار کر دیا، انسان نے اسے اپنی بے باکی اور جہالت و نادانی کی وجہ سے اٹھالیا: ﴿فَحَمَلَهَا الْإِنْسَانُ إِنَّهُ كَانَ ظَلُومًا جَهُولًا﴾ (الاحزاب: ۷۲)

امانت میں خیانت کی ہے جس کا بار خود اپنے اوپر اپنی پسند سے ڈال لیا۔ یہ زبردست ذمہ داری اور اہم امانت کو اٹھانا انسان کی بڑی نادانی اور اندھا پن تھا، اسی لئے وہ بڑا ظالم اور نادان قرار دیا گیا ہے۔

آٹھویں صفت بھول اور نسیان

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهُ مُنِيبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهُ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُو إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلَّهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيلِهِ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيلًا إِنَّكَ مِنْ أَصْحَابِ النَّارِ﴾ (الزمر: ۸/۳۹)

”جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو اپنے رب کو دھیان دے کر پکارتا ہے اور جب وہ اسے اپنی کسی نعمت سے نواز دیتا ہے تو جس (تکلیف) کے لئے پہلے پکارتا تھا اس (کے ازالے) کو فراموش کر دیتا ہے اور اللہ کا شریک بنانے لگتا ہے تاکہ اس کے راستے سے گمراہ کرے۔ آپ ﷺ فرمادیں کہ اپنے کفر کا تھوڑا سا فائدہ اٹھا لو، بے شک تم جہنم والوں میں سے ہو“

نیز اس کا ارشاد ہے:

﴿فَإِذَا مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ إِذَا خَوَّلْنَاهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ إِنَّمَا أُوتِيتُهُ عَلَىٰ عِلْمٍ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ وَلَكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ﴾ (الزمر: ۳۹/۳۹)

”جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے پھر جب ہم اسے اپنی کوئی نعمت دیتے ہیں تو کہتا ہے کہ میں نے اسے علم کی بدولت حاصل کیا ہے بلکہ یہ ایک آزمائش ہے لیکن ان میں زیادہ تر اسے نہیں جانتے“

اس کا یہ بھی ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (ط: ۱۱۵/۲۰)

”اور اس سے پہلے ہم نے آدم سے اقرار لیا تو وہ بھول گیا اور ہم نے اس میں عزم نہیں پایا“

بے شک بھول اور نسیان انسان کی فطرت و سرشت میں داخل ہے۔ اور اگرچہ یہ اس لحاظ سے انسان کے لئے ایک نعمت ہے کہ اس کے افکار و مصائب کو فراموش کر دیتی ہے اور ان کی یاد آنے نہیں دیتی۔ لیکن اگر وہ اسی اقرار کو فراموش کر دے اور اس وعدے کو وفا نہ کرے جس کا اس سے وعدہ لیا گیا ہے تو اس کے لئے ایک عذاب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے اپنی عبادت کرنے اور شرک نہ کرنے کا اقرار لیا ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے اس کو بیان کرنے اور لوگوں سے نہ چھپانے کا عہد و پیمان لیا تھا۔ جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو نیک اعمال کا پابند بن جاتا ہے اور اپنے رب کو مشکل وقت میں یاد کرتا ہے اور جب اللہ اسے کسی نعمت سے نوازتا ہے تو پھر وہ اللہ تعالیٰ سے غافل ہو جاتا ہے، اپنی دعا و پکار کو فراموش کر دیتا ہے اور اپنے نفس اور خواہش کا بندہ بن جاتا ہے۔ مشکل میں اپنے رب کو پکارنا اور رونا انسان کی ایسی فطرت ہے جو صرف مشکل کے وقت ظاہر ہوتی ہے اسلئے پائیدار نہیں ہوتی۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَى أَنْفُسِهِمْ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوا بَلَى شَهِدْنَا أَنْ تَقُولُوا يَوْمَ الْقِيَمَةِ إِنَّا كُنَّا عَنْ هَذَا غَافِلِينَ﴾ (الاعراف: ۱۷۲/۷۷)

”اور اس وقت کو یاد کرو جب تمہارے رب نے بنو آدم (انسانوں) کی پشت سے ان کی ذریت کو لیا اور انہیں ان کے اوپر شاہد بنایا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ سب نے کہا: کیوں نہیں! ہم شاہد ہیں (یہ عہد اس لئے لیا) کہ قیامت کے روز یہ نہ کہو کہ ہم ان سے غافل رہ گئے“

اور اس نے فرمایا:

﴿وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا فَبَيَّسَ مَا يَشْتَرُونَ﴾ (آل عمران: ۷۵/۷۶)

”اور اس وقت کو یاد کرو جب اللہ نے ان سے اقرار لیا جو کتاب دیئے گئے کہ تم ضرور لوگوں کے لئے اسے بیان کرو گے اور چھپاؤ گے نہیں تو انہوں نے اسے پس پشت ڈال دیا اور اس کے عوض تھوڑی قیمت خرید لی تو وہ کیا ہی بری چیز خرید رہے ہیں!“

قارون نے کہا کہ مجھے مال، اپنے علم کی بدولت دیا گیا اور اس زمانے میں بہت سے لوگ جو مال یا جاہ و جلال یا علم وغیرہ کے فریب میں ہیں، وہ اس نعمت کے سرچشمے کو جس سے لطف اندوز ہو رہے ہیں، فراموش کر بیٹھے ہیں۔

انسان کی بھول اس وقت نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتی ہے جب سختی اور ابتلاء کی منزل کو عبور کر کے عیش و آسائش حاصل کر لیتا ہے۔ اگر اسے یہ علم ہو جائے کہ یہ آرام و راحت، یہ مال و جاہ اور یہ منصب و علم ایک آزمائش اور امتحان ہے تو وہ اپنے رب کو نہیں بھولے گا اور اس کے ایمان اور جذبہ شکر میں اضافہ ہو جائے گا لیکن اس بھول اور نسیان کو تو انہوں نے اپنے باپ دادا سے وراثت میں پایا ہے، جن سے اس کے پروردگار نے عہد لیا تو بھول گئے۔ یہ ان کی اولاد کی طبیعت اور فطرت بن چکی ہے مگر اللہ تعالیٰ جس کی حفاظت فرمادے۔

نویں صفت بے صبری و بے قراری

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا، إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا، وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا، إِلَّا

(۷) تھروڈلی

انسان کی تمنائوں اور آرزوں کے نتائج مختلف اشکال، حرص، طمع، جزع و فزع کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ جب فراوانی رزق، اختیارات، سلطنت اور عزت و شہرت حاصل ہوتی ہے تو وہ اترانا شروع کر دیتا ہے اور جونہی اس پر کوئی مصیبت آتی ہے تو بالکل بے حوصلہ ہو جاتا ہے۔ بڑے سے بڑا مضبوط اعصاب کا مالک اندر سے ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ تنگدستی کے وقت خوشحالی کے

الْمُصَلِّينَ (المعارج: ۲۲ تا ۱۹/۷۰) ”بے شک انسان بے صبر پیدا کیا گیا ہے اور جب اسے نقصان پہنچتا ہے تو بے قرار ہو جاتا ہے اور جب دولت ملتی ہے تو کنجوس ہو جاتا ہے مگر جو نمازی ہیں“ جب انسان خیر حاصل کرتا ہے تو متقی اور پرہیزگار بن جاتا ہے۔ شر حاصل کرتا ہے تو بد اعمالیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس کے مومن ہونے اور مومن نہ ہونے کی صورت میں اس کی یہی خوبی حقیقت ظاہر ہوتی ہے۔ جب اس کا دل ایسے ایمان سے خالی ہوتا ہے جو اس کے دل کو مطمئن کرے اور اس کا رشتہ اس کے رب سے جوڑے تو وہ اپنی اصل فطرت بے صبری و بے قراری میں گرفتار رہتا ہے۔ اور پھر جب بے تاب ہو جاتا ہے تو سوچتا ہے کہ یہ مصیبت اس سے دور نہیں ہوگی اور ہمیشہ اس کے ساتھ رہے گی۔ وہ یہ بھول جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے لئے کشائش پیدا کرے گا اور اس مشکل کو آسان بنائے گا۔ وہ بے صبر ہو کر کف افسوس ملتا ہے۔

جب خیر اور مال و جاہ یا علم حاصل کرتا ہے تو کنجوس بن جاتا ہے اور اسے دوسروں تک نہیں پہنچاتا وہ اپنے نفس اور مال کا بندہ بن جاتا ہے اور اس کی ہوس اور کنجوسی بڑھ جاتی ہے۔ اس کا معاملہ صرف ایمان اور پابندی نماز ہی سے درست ہو سکتا ہے۔ اسی لئے اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿إِلَّا الْمُصَلِّينَ، الَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ دَأْمُونَ، وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ، لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ، وَالَّذِينَ يُصَدِّقُونَ بَيَّومَ الدِّينِ، وَالَّذِينَ هُمْ مِنْ عَذَابِ رَبِّهِمْ مُشْفِقُونَ، إِنَّ عَذَابَ رَبِّهِمْ غَيْرُ مَأْمُونٍ، وَالَّذِينَ هُمْ لِغُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ، إِلَّا عَلَى أَرْوَاحِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ، فَمَنْ ابْتَغَى وَرَاءَ ذَلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ لَا مَلَنِيَّتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ، وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ﴾ (المعارج: ۲۲ تا ۳۴)

”جو سدا نماز پڑھتے ہیں، جن کے مالوں میں سائل (فقیر) اور بے نصیب کا مقررہ حصہ ہے، جو بدلے کے دن کا یقین رکھتے ہیں اور جو اپنے رب کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں، بے شک تمہارے رب کا عذاب بے خوف رہنے کا نہیں اور جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں مگر اپنی بیویوں اور کنیزوں پر، ان پر کچھ الزام نہیں اور جو ان (بیویوں اور کنیزوں) کے سوا (جنسی ذرائع) چاہتے ہیں، وہی حد سے تجاوز کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور وعدوں کا خیال رکھتے ہیں اور جو اپنی گواہیوں پر ثابت رہتے ہیں اور جو اپنی نماز کی خرداری رکھتے ہیں“

حصول کے لئے اس کے ہاں دعاؤں اور منتوں کے انبار، نذر و نیاز کا پستارہ اور خیرات و صدقات کی فراوانی نظر آتی ہے۔ مگر مقصود حاصل ہوتے ہی اندیشہ فردا، خیال مستقبل اور بچوں کی فکر آ گھیرتی ہے۔ اس وقت تکمیل منت تو درکنار معمولی سے معمولی صدقات کے دروازے بھی وہ بند کر دیتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا﴾ (رح: ۷۰) ”بے شک انسان تھردلا پیدا کیا گیا ہے، جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اٹھتا ہے اور جب اسے خوشحالی نصیب ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے“

انسان کا دل جب ایمان سے خالی ہوتا ہے تو اس کی مثال ہوا کے سامنے ایک پر کی مانند ہوتی ہے۔ وہ معمولی تکلیف یا نقصان سے بے تاب ہو جاتا ہے اور تھوڑی سی بات پر خوش ہونے لگتا ہے۔ وہ اُداس و بے صبرا بن کر خوف، ڈر اور خوشی و کنجوسی کے درمیان ہچکولے کھانے لگتا ہے لیکن جب اس کا دل ایمان سے آباد ہوتا ہے تو اس کا نفس مطمئن رہتا ہے اور اسے سکونِ قلب نصیب ہوتا ہے۔ وہ پریشانی کے وقت سنگدل اور مصیبت کے وقت اُداس نہیں ہوتا بلکہ اس پر صبر کرتا ہے کیونکہ اسے یقین ہوتا ہے کہ تنگی کے بعد آسانی اور مشکل کے بعد کشائش ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اس کی مصیبت کا، یہاں تک کہ کاٹا بھی چھج جائے تو اس کا بدلہ دے گا۔ اور یہ کہ جو کچھ بھی نعمت ملے وہ اللہ کی طرف سے ایک آزمائش و امتحان ہے۔ اس لئے اس کا دل دنیا کی نعمتیں ملنے پر خوشی سے اُڑنے نہیں لگتا۔ بلکہ وہ اس کا حساب کرتا ہے اور اللہ کی آزمائش اور ناشکری سے ڈرتا ہے لہذا اس کا دل ثابت، طبیعت مطمئن اور پرسکون اور اس کی حالت برقرار رہتی ہے۔

ایمان دنیا و آخرت کی ایک پائیدار سعادت ہے اور فسق و فجور دنیا و آخرت کی پائیدار شقاوت ہے۔ اسی طرح نماز حقیر بندے اور اس کے طاقتور و زبردست رب کے درمیان ایک ایسا رشتہ ہے جو اسے سکون و اطمینان اور طاقت و ثبات دیتی ہے۔ صرف ایسی نماز جو پابندی سے بلا ناغہ ادا کی جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک محبوب عمل وہی ہے جو مسلسل ہو اگرچہ کم ہو۔ زکوٰۃ و صدقہ مؤمن کے مال میں ایک واجب حصہ ہوتا ہے جسے ادا کئے بغیر اسے قرار نہیں ہوتا اور اسے ادا کرتے وقت وہ اسے سعادت اور اپنے مال کی آلودگیوں سے صفائی سمجھتا ہے۔ اس کے ذہن میں یہ بات راسخ ہوتی ہے کہ وہ فقیروں اور غریبوں کی مدد اور تعاون کر رہا ہے۔ اسے جب بھی موقع ملے، خیرات کرتا رہتا ہے۔ اور یومِ جزا اور حساب پر ایمان اس کے نفس کو سکون و قرار دیتا ہے اور وہ خوش ہوتا ہے کہ ادھر ایک ایسا دن ہے جس میں ہر ایک کو اس کے عمل کا بدلہ دیا جائے گا اور کسی کا کوئی عمل ضائع نہیں جائے گا لیکن جو شخص آخرت اور حساب کو نہیں مانتا جب اس سے کوئی چیز چھوٹ جاتی ہے یا برباد ہو جاتی ہے یا کوئی اس پر زیادتی کر دیتا ہے تو اس کا دل حیرت اور پریشانی سے ٹکڑے ٹکڑے ہونے لگتا ہے کیونکہ وہ اپنی محدود و مختصر عمر کے بارے میں ہی سوچتا ہے۔

جو شخص اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا اور آخرت کی جزا کا امیدوار ہوتا ہے وہ حساسیت کے بلند مرتبے پر ہوتا ہے اور دنیا میں دونوں آنکھیں، دل اور حواس کھول کر چلتا ہے۔ وہ کوئی غلط بات منہ سے بولنے اور کوئی غلط کام کرنے یا کوئی نگاہ غلط اٹھانے سے ڈرتا ہے۔ وہ اللہ کی ہدایت اور اس کے رسول ﷺ کی سنت پر چلتا ہے اور وہ اپنی شرمگاہ کی حفاظت کرتا ہے۔ اپنی بیوی اور کنیز کو چھوڑ کر زنا کاری نہیں کرتا اور نہ دوسری عورتوں کی طرف نگاہ ڈالتا ہے۔ بے شک وہی پاک اور صاف ستھرا ہے جو اپنی صفائی کو نافرمانیوں اور گناہ کا دھبہ نہیں لگاتا اور محرمات کو نہیں توڑتا۔ وہی مطمئن ہوتا ہے جس کے اعصاب پرسکون اور جس کی طبیعت خوش رہتی ہے، اس لئے کہ طبیعت کا سکون ہی راحت بخش زندگی ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَمِنْ آيَاتِهِ أَنْ خَلَقَ لَكُمْ مِنْ أَنْفُسِكُمْ أَزْوَاجًا لِتَسْكُنُوا إِلَيْهَا وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَوَدَّةً وَرَحْمَةً﴾ (الروم: ۲۱/۳۰)

”اور اس کی نشانیوں میں سے ہے کہ تمہارے لئے تمہیں میں سے اس نے تمہارے جوڑے بنائے تاکہ ان سے سکون حاصل کرو اور تمہارے درمیان محبت و رحمت پیدا کی“

لہذا سکون و قرار، زوجیت کے اچھے امکان میں ہوتا ہے۔ یہی محبت اور رحمت ہے۔ اس کے علاوہ حیوانی خواہشات اور دنیا و آخرت کا عذاب ہے۔ اور جو اپنی امانتوں اور وعدے کا پاس رکھتے ہیں وہی بہترین عادات و سیرت کے حامل ہوتے ہیں یعنی جو لوگ اولاً اپنے رب کی عبادت کر کے اور ثانیاً اپنے اہل و عیال، نوکر چاکر اور تعلق داروں کے حقوق ادا کر کے اور کان، آنکھ اور اعضا کی حفاظت کر کے اپنی امانتوں کا لحاظ رکھتے ہیں، وہی اچھی عادات اور کردار کے مالک ہیں۔

لوگوں کی امانتیں، مال و عزت اور آبرو وغیرہ بہت سی چیزیں ہیں۔ جو شخص ان میں خیانت کرے، اس کے لئے خوف اور بے قراری کا سامنا کرنے کی وعید ہے۔ جس نے ان کی حفاظت کی تو اس نے اپنے دین اور نفس کی حفاظت کر لی اور دنیا و آخرت کی سعادت حاصل کر لی۔ اسی طرح شہادت پر مومن کا ثابت قدم رہنا ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿الَّذِينَ هُمْ بِشَهَادَتِهِمْ قَائِمُونَ﴾ (المعارج: ۳۳/۷۰) ”جو اپنی گواہیوں پر ثابت رہتے ہیں“ نیز اس کا ارشاد ہے:

﴿وَأَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلَّهِ﴾ (الطلاق: ۲/۶۵) ”اور اللہ کے لئے شہادت قائم کرو“

لہذا اسے ادا کرنے میں کوتاہی کرنا یا اسے ضائع کر دینا یا چھپا دینا بہت بڑا گناہ اور زمین میں فساد اور معاشرتی انتشار پیدا کرنا ہے کیونکہ حدود قائم کرنا، شہادت اور عدل و انصاف کے بغیر ناممکن ہے اور اللہ تعالیٰ کے لئے شہادت کو اس کی درست صورت پر ادا کئے بغیر معاشرے میں سکون قائم نہیں ہو سکتا۔

نماز کا قیام، انسان کی اصلاح کے لئے نہایت اہم ہے۔ اسی لئے اللہ نے سورہ معارج کی مذکورہ بالا آیات میں اسی سے آغاز کیا اور اسی پر انتہا کی ہے۔ لہذا نماز ایک ایسی چیز ہے کہ جس نے اس کی حفاظت کی، اس نے اپنے پورے دین کی حفاظت کر لی اور اس کے تمام امور سدھر گئے۔ اللہ کا ارشاد ہے:

﴿وَالَّذِينَ هُمْ عَلَى صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ، أُولَٰئِكَ هُمُ الْوَارِثُونَ، الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ، هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾ (المؤمنون: ۹/۲۳ تا ۱۱) ”جو اپنی نمازوں کی نگہبانی کرتے

ہیں۔ یہی وارث ہیں جو جنت الفردوس کے وارث ہوں گے جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے“

دسویں صفت..... دسویں

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ، مَلِكِ النَّاسِ، إِلَهِ النَّاسِ، مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ،

الَّذِي يُوسِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ، مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ ﴿ (الناس: ۱۱۳/۷۱)

(۸) اضطراب و اعراض

ہر طبقہ کے انسان اپنے اپنے مرتبہ و منصب کے مطابق مصائب و آلام کا شکار ہوتے ہیں۔ غربا کے لئے فکرِ عیال، اُمرا کے لئے خوفِ مال، حکمرانوں کے لئے اندیشہ زوال..... سب ہی اپنی اپنی مصیبتوں میں خدا کو پکارتے ہیں۔ حتیٰ کہ الحاد زدہ انگلستان کو بھی جب جرمنی سے خطرہ درپیش تھا تو ملک کے اندر عیسائیوں کے گرجے، ہندوؤں کے مندر اور مسلمانوں کی مسجدیں غرضیکہ ہر مذہب و ملت کی عبادت گاہیں سرکاری طور پر دعا کے لئے منتخب کی گئیں۔ مصیبت میں یہ عاجزی و انکساری اور آہ و زاری اور دفع مصیبت کے بعد خدا اور اس کے احکام سے کھلم کھلا بیزاری انسانی فطرت کے عجائب ہیں، ﴿إِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَأَىٰ بِجَانِبِهِ وَإِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُو دُعَاءٍ عَرِيضٍ﴾ (الاسراء: ۸۳)

”جب ہم انسان پر اپنی نعمتیں نازل کرتے ہیں تو وہ اعراض کرتا ہے، اور اپنا پہلو بچاتا ہے اور جب مبتلائے مصیبت ہوتا ہے تو لمبی چوڑی دعائیں مانگنے لگتا ہے“

غربت و افلاس کی زندگی گزارنے کے بعد اگر کسی کو حسن اتفاق یا قوتِ بازو سے کوئی وسیلہ رزق حاصل ہو جاتا ہے تو وہ اپنے اللہ، انسان، اقربا، قوم، مذہب سب کے حقوق بھول جاتا ہے:

﴿وَلَيَعْلَنَ آذَقْنَا الْإِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنَاهَا مِنْهُ إِنَّهُ لَيَكْفُرُ وَلَكِنْ آذَقْنَاهُ نِعْمَةً بَعْدَ ضَرَاءٍ مَّسْتَةً لَّيَقُولَنَّ ذَهَبَ السَّيِّئَاتُ عَنِّي إِنَّهُ لَفَرِحَ فَخُورٌ﴾ (ہود: ۱۰، ۹)

”جب ہم انسان کو اپنی کوئی رحمت چکھاتے ہیں پھر اس سے چھین لیتے ہیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور جب ہم اسے پریشانی کے بعد نعمت چکھاتے ہیں تو وہ ضرور کہتا ہے کہ میری پریشانیوں دور ہو گئیں اور اترانے، فخر کرنے لگتا ہے“

انسان رب کی عطا کردہ نعمتوں کو اپنا استحقاق گردانتا ہے اور فراوانی رزق کو اپنی خوبی قرار دیتا ہے:

﴿وَلَيَعْلَنَ آذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَاءٍ مَّسْتَةً لَّيَقُولَنَّ هَذَا لِي﴾ (فصلت: ۵۰، ۴۱)

”اور اگر انسان پر مصیبت کے بعد راحت آتی ہے تو کہتا ہے کہ یہ جو کچھ ہے وہ میرے سبب سے ہے“

انسان کشائشِ رزق اور تنگی و ضیقِ حیات کی حالت کو دو عجیب و غریب اثرات کی طرف منسوب کرتا ہے۔ فراوانی رزق کو اپنے پروردگار کی طرف سے اپنی تعظیم قرار دیتا ہے جبکہ تنگی رزق پر اپنی کوتاہیوں پر اپنے آپ کو ملامت کرنے کی بجائے خدا پر اپنی تنگی کا اظہار کرتا ہے

﴿فَإِذَا الْإِنْسَانُ إِذَا مَا ابْتَلَاهُ رَبُّهُ فَلَكْرِمَةً وَنَعْمَةً فَيَقُولُ رَبِّي أَكْرَمَنِ وَأَمَّا إِذَا مَا ابْتَلَاهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهُ فَيَقُولُ رَبِّي أَهَانَنِ﴾ (الفجر: ۸۹، ۱۵)

”انسان کو جب اس کا رب آزماتا ہے تو اس پر کرم کرتا ہے اور اسے نعمتیں دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے میری تعظیم کی اور جب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کی روزی تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے ذلیل کر کے رکھ دیا“

”آپ کہہ دیجئے کہ میں لوگوں کے رب کی پناہ میں آتا ہوں، لوگوں کے مالک کی، لوگوں کے معبود کی (پناہ میں) وسوسہ ڈالنے والے پیچھے ہٹ جانے والے (شیطان) کی برائی سے جو لوگوں کے سینوں (دلوں) میں وسوسہ ڈالتا ہے۔ جو جنوں میں سے ہے اور انسانوں میں سے“

اور اس کا ارشاد ہے:

﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ وَنَعَلَّمَ مَا تَوْسَّوَسُ بِهِ نَفْسُهُ وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ﴾ (ق: ۱۶/۵۰) ”اور ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے اور جو وسوسہ تک اس کے دل میں گزرتا ہے ہم اسے بھی خوب جانتے ہیں اور ہم اس سے اس کی شرک سے بھی زیادہ نزدیک ہیں“ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

إن الشيطان جاثم على قلب ابن آدم فإذا ذكر الله تعالى خنس وإذا غفل وسوس ”شیطان ابن آدم کے دل پر بیٹھا رہتا ہے۔ جب وہ اللہ کا ذکر کرتا ہے تو وہ (شیطان) پیچھے ہٹ جاتا ہے اور جب (یاد الہی سے) غافل ہو جاتا ہے تو وہ وسوسہ ڈالتا ہے“

شیطان لعین چھپ کر اور پوشیدہ طور پر وسوسہ ڈالتا ہے اور یہ معرکہ انسان اور شیطان کے درمیان برابر جاری ہے اور یہ معرکہ آدم اور ابلیس کے درمیان، پہلے اس وقت ہوا جب اس نے ان کے اور ان کی بیوی کے دل میں وسوسہ پیدا کیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿فَوَسَّوَسَ لَهُمَا الشَّيْطَانُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وَّرَىٰ عَنْهُمَا مِنْ سَوْءِ تِهْمَا وَقَالَ مَا نَهَكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هَذِهِ الشَّجَرَةِ إِلَّا أَنْ تَكُونَا مَلَكَينَ أَوْ تَكُونَا مِنَ الْخَالِدِينَ﴾ (الاعراف: ۲۰/۷) ”اور شیطان نے دونوں کو وسوسہ ڈالا تاکہ ان کی پوشیدہ شرمگاہیں ان کے لئے ظاہر کر دے اور کہا کہ تمہیں تمہارے رب نے اس درخت سے اس لئے روکا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتے نہ ہو جاؤ (جنت میں) ہمیشہ کے نہ ہو جاؤ“

یہ وسوسہ جس طرح شیاطین و جنات کی طرف سے ہوتا ہے ایسے ہی ان انسانوں کی طرف سے بھی ہوتا ہے جو برے اور شریر ساتھی ہوتے ہیں اور یہ شیطان کے وسوسے سے سخت ہوتا ہے۔ ان میں چغل خور، عیب جو، شر پسند، فساد پرور، بدعات اور نفسانیت کے پرستار شامل ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو خوشنما اور پرفریب باتوں کی تلقین کرتے رہتے ہیں۔ یہ معرکہ شیاطین اور صالحین و مؤمنین کے درمیان برابر جاری ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجِدَلُوَكُمْ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ﴾ (الانعام: ۱۲۱/۶) ”بے شک شیاطین اپنے دوستوں کی طرف وسوسہ ڈالتے ہیں تاکہ وہ تم سے جھگڑیں اور اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو یقیناً تم مشرک ہو گے“

شیطان انسان کو دھوکہ دینے کے لئے ان کے سامنے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں سے آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ثُمَّ لَا تَنِيَّهُمْ مِنْ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ أَيْمَنِهِمْ وَعَنْ شَمَائِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ

﴿اَلْاَعْرَافُ: ۱۷/۱۷﴾ ”پھر میں ان کے پاس ان کے سامنے اور پیچھے اور دائیں اور بائیں سے آؤں گا اور تو ان میں سے زیادہ تر کو شکر گزار نہیں پائے گا“
لیکن ان کا غلبہ اور اقتدار انہی پر ہوتا ہے جو اس کی اطاعت کرتے اور اسے دوست بناتے ہیں۔
اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اِنَّهٗ لَیْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهٖمْ یَتَوَكَّلُوْنَ، اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَی الَّذِیْنَ یَتَوَلَّوْنَہٗ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِهٖ مُّشْرِكُوْنَ﴾ (النحل: ۹۹/۱۰۰)
”بے شک ان لوگوں پر اس (شیطان) کا کوئی قابو نہیں جو ایمان لائے اور اپنے رب ہی پر بھروسہ کرتے ہیں، اس کا قابو تو انہی پر ہے جو اسے اپنا دوست بناتے ہیں اور جو اس (اللہ) کے ساتھ شرک کرتے ہیں“

اللہ تعالیٰ انسان کے نفس کے وسوسے کو بھی جانتا ہے اور اس پر زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں۔ وہ پوشیدہ و ظاہر کو یکساں جانتا ہے۔ لہذا انسان کو شیاطین کے وسوسے سے ڈرنا چاہئے کیونکہ یہ اس کے جال اور پھندے ہیں جس سے وہ اس کو شکار کر لیتا ہے جو اس کے پیچھے دوڑتا ہے۔ مؤمن کو چاہئے کہ اس کے وسوسے اور اس کی انگلیخت سے پناہ مانگتا رہے کیونکہ شیطان کمزور اور چور ہے اور جو لوگ اللہ کا ذکر کرتے ہیں ان کے پاس سے فرار ہو جاتا ہے۔ وہ ان سے دور رہتا ہے جیسا کہ حدیث میں آیا ہے کہ ”شیطان حضرت عمر بن خطابؓ کے نزدیک نہیں جاتا اور اگر وہ کسی وادی میں چل رہے ہوتے ہیں تو شیطان دوسری وادی کی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ لیکن جو شخص اللہ کے ذکر سے غافل رہتا ہے، شیطان اس کے نزدیک ہو جاتا ہے اور اس کے ساتھ رہتا ہے“..... اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ یَّعِشْ عَنْ ذِکْرِ الرَّحْمٰنِ نُقِیْضْ لَہٗ شَیْطٰنًا فَہُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ وَّاِنَّہُمْ لَیَصْذُوْنَہُمْ عَنِ السَّبِیْلِ وَیَحْصِبُوْنَ اَنّٰہُمْ مُّہْتَدُوْنَ﴾ (الزخرف: ۳۳/۳۶، ۳۷)
”اور جو اللہ کی یاد سے غافل ہو جائے، ہم اس کے لئے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو اس کا ساتھی بن جاتا ہے اور وہ اسے (سیدھے) راستے سے روکتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ ہم ہدایت یافتہ ہیں“

گیارہویں صفت..... غرور و تکبر

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ مَا غَرَّکَ بِرَبِّکَ الْکَرِیْمِ الَّذِیْ خَلَقَکَ فَسَوَّکَ فَعَدَلَکَ فِیْ اٰیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَکَّبَکَ﴾ (الانفطار: ۸۲/۸۳ تا ۸۴)
”اے انسان! تیرے شفیق رب سے کس چیز نے تجھے فریب میں رکھا ہے، جس نے تجھے پیدا کیا اور درست اور مناسب بنایا۔ جس صورت میں چاہا تجھے ترکیب دی اور ڈھالا“
اور اس کا ارشاد ہے:

﴿ذٰلِکُمْ بِاَنِّکُمْ اَتَّخَذْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ هُزُوًا وَّعَرَّضْتُمْ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا﴾ (الحاثیہ: ۳۵/۳۵)

”یہ اس لئے کہ تم نے اللہ کی آیتوں کو مذاق بنالیا اور تمہیں حیاتِ دنیا نے مبتلائے فریب کر دیا“

نیز اس نے فرمایا ہے:

﴿وَلَا يَكْنُكُمْ فَتَنْتُمْ أَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْأَمَانِيُّ حَتَّىٰ جَاءَ أَمْرُ اللَّهِ وَغَرَّكُمْ بِاللَّهِ الْغُرُورُ﴾ (الحمدید: ۱۴/۵۷)

”لیکن تم نے خود کو فتنے میں ڈال دیا اور انتظار کیا اور تمہیں جھوٹی آرزوؤں نے فریب خوردہ بنا دیا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا اور شیطان نے تمہیں اللہ کے بارے میں فریب میں ڈال دیا“

اور اس کا ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْكُفْرَؤْنَ إِلَّا فِي غُرُورٍ﴾ (الملک: ۲۰/۶۷) ”بے شک کا فر صرف فریب میں ہیں“

ان آیات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غرور کی صفت انسان میں اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ اللہ کے راستے سے دور ہو جاتا ہے اور اپنے رب سے باغی ہو جاتا ہے پھر اس کے واجبات میں کوتاہی کرتا اور اس کی نواہی کا ارتکاب کرتا ہے حالانکہ اسی نے اسے گونا گوں نعمتوں سے نوازا ہے۔

انسان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے اسی سے غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ فریب میں مبتلا ہو کر سوچتا ہے کہ وہ امن و اطمینان میں ہے۔ وہ ہلاکت کے کام کرنے لگتا ہے اور اللہ کے غیظ و غضب کے لئے خود کو پیش کر دیتا ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ اسے مہلت دیتا ہے اور وہ اپنی شفاعت کے لئے کوئی نیک عمل اور ایمان و تقویٰ پیش نہیں کرتا۔ لہذا انسان کی خود فریبی کی صفت صرف تقویٰ، درست عقیدے اور اللہ سبحانہ کے ڈر سے ہی دور ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿وَمَا الْحَيَوةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعُ الْغُرُورِ﴾ (الحمدید: ۲۰/۵۷)

”دنیا کی زندگی صرف دھوکے کا سامان ہے“..... اور فرمایا:

﴿فَلَا تَغُرَّنَّكُمُ الْحَيَوةُ الدُّنْيَا وَلَا يَغُرَّنَّكُمُ بِاللَّهِ الْغُرُورُ﴾ (لقمان: ۳۳/۳۱)

”تمہیں حیاتِ دنیا فریب میں نہ ڈال دے اور تمہیں شیطان اللہ سے دھوکہ نہ دے دے“

بارہویں صفت..... کاوش و محنت

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْإِنْسَانُ إِنَّكَ كَادِحٌ إِلَىٰ رَبِّكَ كَدْحًا فَمُلَاقِيهِ﴾ (الانشقاق: ۶/۸۴)

”اے انسان! بے شک تو مشقت اٹھائے اپنے رب کی طرف جا رہا ہے اور اس سے جا ملے گا“

(۹) مشقت

انسان اپنی خلقت کے لحاظ سے کمزور، پیدائش کے اعتبار سے نازک اور جسم و توانائی میں نحیف لیکن ہر آن کشمکش کے لیے وقف ہے۔ اس کے بازاری حیات کی رونق، اس کی زندگی کا مدار اور معیشت کا انحصار تصادم کے دم قدم پر ہے۔ جب تک یہ تصادم قائم ہے، زندگی کا سانس چلتا ہے۔ تصادم اور کشمکش ختم ہو گئی

نیز اس کا ارشاد ہے:

﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾ (البلد: ۴/۹۰) ”ہم نے انسان کو مشقت میں پیدا کیا“

انسان اس دنیا میں مشقتیں برداشت کرتے ہوئے اور روزی کی طلب میں کوشش کرتے ہوئے سفر حیات طے کرتا ہے۔ وہ اپنے رب تک رسائی کے لئے اپنا رستہ بناتا ہے کیونکہ اسے محنت و کاوش اور تکان کے بعد اسی کی طرف لوٹنا اور اسی کے پاس ٹھکانہ بنانا ہے۔ اس دنیا میں اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے انسان اپنے بدن یا ذہن یا دونوں کو تھکا دیتا ہے۔ اگر اسے مال مل گیا تو اس کی تکان اور بڑھ جاتی ہے اور اگر جاہ و منصب مل گیا تو اس کی فکر اور غم اور بڑھ جاتا ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ۷

كلما ازداد الفتى علما بها

كلما يدخل في عيش أمر

”جیسے جیسے کسی نوجوان کو اس کا زیادہ علم ہوتا ہے، زیادہ کڑوی زندگی میں داخل ہو جاتا ہے“

یہ مشقت و تکان کی زندگی ہے جس میں آرام و سکون نہیں، یہ مشقت و تکلیف اور حسرت و آرزو کی زندگی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے ۷

وما السعادة في الدنيا سوى أمل

يرجى، فإن صار حقا مله البشر

”دنیا کی سعادت آس و امید کے سوا کچھ نہیں اور اگر پوری ہو جائے تو خوشی اسے آرزو کر دیتی ہے“

لہذا انسان طلب دنیا میں جو مشقت اٹھاتا ہے اگر وہ اپنے رب کی عبادت میں اٹھاتا رہے تو اللہ اس کے بدلے میں اسے قلبی سعادت اور آخرت کا اجر دیتا ہے۔ لیکن اگر وہ دنیا کی مشقت اٹھائے تو اس کی فکر اور غم و بدبختی اور بڑھ جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

تو اس پر موت کی گہری نیند طاری ہو جائے گی۔ اس کی ساری زندگی مشقت اور سختیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے ہی گزر جاتی ہے کیونکہ اس کی تخلیق میں مشقت کا عنصر شامل ہے ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِي كَبَدٍ﴾ (البلد: ۴/۹۰) ”بے شک ہم نے انسان کو مشقت میں ڈال کر پیدا کیا ہے“

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

”انسان کے مشقت سے پیدا کئے جانے کا مطلب یہ ہے کہ انسان اس دنیا میں مزے کرنے اور چین کی بنی بجانے کے لئے پیدا نہیں کیا گیا بلکہ اس کے لئے یہ دنیا محنت، مشقت اور سختیاں جھیلنے کی جگہ ہے۔ اور کوئی انسان بھی اس حالت سے گزرے بغیر رہ نہیں سکتا..... ہر انسان کی زندگی، ماں کے پیٹ میں نطفہ قرار پانے سے لے کر موت کی آخری سانس تک، اس بات پر گواہ ہے کہ اس کو قدم بقدم پر تکلیف، مشقت، محنت، خطرات اور شدائد کے مرحلوں میں سے گزرنا پڑتا ہے“ (تفہیم القرآن: جلد ششم، ص ۳۳۹)

﴿وَمَنْ أَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِي فَإِنَّ لَهُ مَعِيشَةً ضَنْكًا وَنَحْشُرُهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ أَعْمَى قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِي أَعْمَى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيرًا قَالَ كَذَلِكَ أَتَتْكَ آيَاتُنَا فَنَسِيتَهَا وَكَذَلِكَ الْيَوْمَ تُنْسَى﴾ (طہ: ۱۲۴/۱۲۶)

”اور جس نے میرے ذکر سے منہ موڑ لیا اس کے لئے تنگ زندگی ہے اور ہم اسے قیامت کے روز اندھا بنا کر اٹھائیں گے، وہ کہے گا کہ ”میرے رب! مجھے اندھا کیوں اٹھایا جبکہ میں بینا تھا“ تو اللہ فرمائے گا کہ: ”ایسے ہی تمہارے پاس میری آیتیں آئیں تو تم نے انہیں فراموش کر دیا اسی طرح تم آج اس دن فراموش کر دیئے جاؤ گے“

لوگ محنت و مشقت کے معاملے میں بھی مختلف سوچ رکھتے ہیں۔ بعض لوگ علم کی جستجو میں محنت کرتے ہیں اور بعض دنیا سمیٹنے میں محنت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جن کی ساری کوشش دوسروں کو اللہ کے راستہ سے روکنے کے لئے صرف ہوتی ہے اور بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لئے کوشش کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو جنت کی طلب اور رب کی رضا کے لئے محنت کرتے ہیں۔ بعض ایسے ہیں جو نفسانی خواہشات کی تکمیل اور نوع بہ نوع معاصی کے لئے کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لہذا اے انسان! تو راہ جنت کو اختیار کرنے کہ دوزخ کو۔ باقی محنت و مشقت، رنج و غم تو اللہ تعالیٰ نے دنیا پرستوں کے لئے، دنیا و آخرت دونوں میں لکھ دیا ہے۔

جبکہ طالبین جنت کو سکون و قرار اور راحت و اطمینان دنیا و آخرت دونوں جگہ ملتا رہے گا کیونکہ جب اسے ثواب و بہترین اجر کا علم ہوا تو اس نے اپنے رب کو خوش کرنے کے لئے نوع بہ نوع محنت و مشقت کرنا شروع کر دی۔ اس محنت و ریاضت میں بھی اسے وہ سکون اور اطمینان ملتا ہے جو دنیا کی ہر آسائش پالنے والے کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا۔

تیرہویں صفت..... سرکشی و ناشکری

(۱۰) سرکشی

حد سے بڑھی ہوئی بے باکی و سادگی کے ساتھ اگر جبر و اختیار، سلطنت اور فراوانی شامل ہو جائے تو انسان میں ایک ایسی سرکشی جنم لیتی ہے جو انفرادی صورتوں میں عیش پرستی، بد اعمالی اور اطلاق حقوق کا سبب بنتی ہے۔ جبکہ اجتماعی معاملات میں ایک ظالم حکومت اور جابر سلطنت کا روپ دھار لیتی ہے۔ اس کی نمایاں مثال فرعون ہے: ﴿وَفَرَعَوْنَ ذِي الْأَوْتَادِ، الَّذِينَ طَغَوْا فِي الْبِلَادِ فَاكْثَرُوا فِيهَا الْفَسَادَ﴾ (الفجر: ۸۹، ۱۱، ۱۰) ”اور میمنوں والا فرعون! یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے دنیا کے ملکوں میں بڑی سرکشی کی تھی اور ان میں بہت فساد پھیلایا تھا“ دولت کی فراوانی اور رزق کی کشادگی بھی انسان کو اپنے معبود حقیقی کے قانون کا باغی بنا دیتی ہے: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنَافٍ﴾ (علق: ۶: ۹۶) ”بے شک انسان اپنے آپ کو نفی دیکھ کر سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے“

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿كَلَّا إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَإِطْفَافٌ ۚ إِنَّهُ يَسْتَفْهِمُ ۚ﴾ (العلق: ۶-۷)

”یقیناً انسان سرکشی کرتا ہے، اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو غنی سمجھتا ہے“

نیز اس نے فرمایا: ﴿إِنَّ الْإِنْسَانَ لِرَبِّهِ لَكَنُودٌ﴾ (العدایات: ۶۱/۶۰)

”بیشک انسان اپنے رب کا بڑا ناشکر ہے“ (یعنی وہ اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتا ہے)

عام طور پر انسان اپنے رب کا شکریہ ادا نہیں کرتا اور نہ اس کی نعمتوں کا اقرار کرتا ہے۔ وہ سرکشی و برائی کرتا اور مالدار کی وقت اتراتا ہے۔ اپنے رب کی گونا گوں نعمتوں کے باوجود اس سے منہ پھیر لیتا ہے اور دور ہو جاتا ہے۔ بے شک انسان کا ایسا کردار یہ ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کی نعمتوں کی ناشکری اور ان کا انکار کرتا ہے۔ اس طرح وہ خود اپنی اس ناشکری کا شاہد ہے:

﴿وَإِنَّهُ عَلَىٰ ذَٰلِكَ لَشَهِيدٌ﴾ (العدایات: ۷۱/۷۰) ”بے شک وہ اس پر گواہ ہے“

اور اس کا معاملہ اسی وقت درست ہوتا ہے جب وہ زمین کی زندگی سے آسمان کی زندگی کی طرف اور دنیا کی تنگی سے آخرت کی وسعت کی طرف بلند ہوتا ہے اور دنیا کی حقیر فکروں کو چھوڑ کر اس سے بڑی اور کشادہ چیز کو اہمیت دیتا ہے۔ شاعر نے کہا ۷

على قدر أهل العزم تأتي العزائم و تأتي على قدر الكرام المكارم
و تكبر في عين الصغير صغارها و تصغر في عين العظيم العظائم
”اہل ہمت کے لحاظ سے ہمتیں ہوتی ہیں، اور شرفاء کے لحاظ سے شرافتیں ہوتی ہیں۔ چھوٹے کی نگاہ میں چھوٹی چیزیں بڑی ہوتی ہیں اور بڑوں کی نگاہ میں بڑی چیزیں بھی چھوٹی ہوتی ہیں“

چودھویں صفت..... غفلت و لاپرواہی

(II) عزم کی کمزوری

بھول چوک اور عزم و ارادہ کی کمزوری بھی انسانی سرشت کا حصہ ہے۔ حضرت آدمؑ کو اللہ تعالیٰ نے جنت کے ایک درخت کے قریب جانے سے روکا ﴿فَلَا تَقْرَبَا هَذِهِ الشَّجَرَةَ﴾ اور ساتھ تنبیہ کی کہ ﴿فَتَكُونَا مِنَ الظَّالِمِينَ﴾ اتنی سخت تنبیہ کے باوجود آدمؑ سے لغزش ہوئی۔ اس لغزش کی وجہ اللہ تعالیٰ نے آدمؑ کی بھول چوک اور عزم کی کمزوری بیان کی ہے، فرمایا: ﴿وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا﴾ (طہ: ۱۱۵:۲۰) ”ہم نے اس سے پہلے آدمؑ کو ایک حکم دیا تھا مگر وہ بھول گیا۔ ہم نے اس میں عزم نہ پایا“..... مولانا مودودیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں: (تفہیم القرآن: جلد سوم، ص ۱۳۰)

”یہاں اللہ تعالیٰ آدمؑ کی پوزیشن صاف کرنے کے لئے قصہ بیان نہیں کر رہا بلکہ یہ بتانا چاہتا ہے کہ وہ بشری کمزوری کیا تھی جس کا صدور ان سے ہوا۔ اور جس کی بدولت صرف وہی نہیں بلکہ ان کی اولاد بھی اللہ تعالیٰ کی پیٹگی تنبیہات کے باوجود اپنے دشمن کے پھندے میں پھنستی رہی ہے“

اللہ تعالیٰ اور اس کے ذکر سے غفلت انسان کی عام صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ مُّعْرِضُونَ﴾ (الانبیاء: ۱۲۱)

”لوگوں کا حساب نزدیک آ گیا اور وہ غفلت میں منہ پھیر رہے ہیں“

اور اس کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا أَنْعَمْنَا عَلَى الْإِنْسَانِ أَعْرَضَ وَنَسَا بِجَانِبِهِ﴾ (الاسراء: ۸۳/۸۴)

”اور جب ہم انسان پر انعام کرتے ہیں تو منہ پھیر لیتا اور پہلو تہی کر لیتا ہے“..... اور فرمایا:

﴿وَإِنَّ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ﴾ (یونس: ۹۲/۱۰)

”اور بے شک بہت سے لوگ ہماری آیتوں سے غافل ہیں“

بے شک بہت سے لوگ اللہ تعالیٰ کی آیتوں سے غافل ہیں اور ان پر توجہ نہیں دیتے۔ نہ اسے یاد کرتے، نہ اس کی آیات پر غور و فکر کرتے ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے مزے لوٹتے ہیں اور باقی سب کچھ فراموش کر دیتے ہیں۔ اس کی جنت و جہنم اور حساب و عذاب کے بارے میں نہیں سوچتے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے فیض یاب ہوتے ہیں لیکن اس کی نافرمانی کرتے اور اس کے ذکر و اطاعت سے اعراض کرتے ہیں اور اکثر لوگوں کی عمر ہی غفلت میں گزر جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَأَنذَرُهمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ إِذْ قُضِيَ الْأَمْرُ وَهُمْ فِي غَفْلَةٍ وَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ﴾

(۱۲) خورگ پیکر محسوس

اللہ تعالیٰ نے انسان میں اپنی روح پھونکی ﴿نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِي﴾ (الحجرہ: ۲۹/۱۵) اس کی روحانی زندگی کی نشوونما کے لئے انبیاء کرام بھیجے لیکن انسان اپنی حسی تسکین کے لیے بالعموم روحانی اعمال کو بھی ماڈی جاے میں دیکھنے کا خواہشمند رہا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ جیسے بت شکن کو بھی بت کے سانچے میں ڈھال کر خانہ کعبہ میں کھڑا کر دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی کبھی بنی اسرائیل پھڑے کی پرستش کرنے لگے۔ تو کبھی انہوں نے اُن دیکھے خدا کو پیکر محسوس کی صورت میں دیکھنے کی خواہش کا ان الفاظ میں اظہار کیا: ﴿لَنْ نُؤْمِنَ لَكَ حَتَّىٰ نَرَىٰ اللَّهَ جَهْرَةً﴾ (البقرہ: ۵۵/۲) ”اے موسیٰ! ہم تیری بات پر اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک اللہ کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں“ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ﴿لَنْ تَرَانِي﴾ کا جواب بھی انسان کی اسی خواہش کا عکاس ہے۔ حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام جیسی موحد و متوکل شخصیت بھی ﴿رَبِّ ارْنِيْ كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰى﴾ ”اے میرے رب مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے“ کا سوال کرتی نظر آتی ہے۔ اللہ کے سوال ﴿اَوَلَمْ تُؤْمِنْ﴾ ”کیا تو ایمان نہیں رکھتا“ کے جواب میں ان کا ﴿وَلَكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قُلُوبِي﴾ (البقرہ: ۲۶۰/۲) ”لیکن میں دل کا پورا اطمینان چاہتا ہوں“ کہنا بھی اس بات کا اظہار ہے کہ انسان اپنے اطمینان کے لئے عالم غیب کی اشیاء اور معاملات کو بھی اپنے محسوسات کے دائرے میں گھیرنا چاہتا ہے۔

”اور انہیں حسرت کے دن سے ڈراؤ جب معاملے کا فیصلہ کر دیا جائے گا اور وہ غفلت میں پڑے ہوئے ہیں“ (مریم: ۳۹/۱۹)

(۱۳) مرغوباتِ نفس

ماویٰ اشیاء سے انسان کا تعلق ان سے فائدے اور تقویت کے حصول کے لئے تو ہوتا ہے لیکن ان اشیاء کی ظاہری چکا چوند، قوت و شوکت کے مظاہر اور حسن و لطافت کے دلکش مناظر سے بھی انسان کا نفس حظ اٹھاتا ہے۔

﴿ذَیِّنَ لِلنَّاسِ حُبَّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ﴾ (آل عمران ۱۴:۳)
”لوگوں کے لئے مرغوباتِ نفس: عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور کھیتیاں بڑی خوشنما بنا دی گئی ہیں“

اللہ نے مرغوباتِ نفس کو شہوت کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ امام راغبؒ صفہانی کے بقول ”شہوت“ نفس کے ان چیزوں کی طرف کھینچنے کو کہتے ہیں جنہیں وہ چاہتا ہے (المفردات)۔ کبھی اس چیز کو شہوت کہہ دیا جاتا ہے جس کی طرف طبیعت کا میلان ہو اور کبھی خود اس جذبہ (میلان) کو شہوت کہتے ہیں۔ (تاج) عورت کا ذکر سب سے پہلے اسی لئے کیا گیا ہے کہ زینت و خوبصورتی کے اعتبار سے نفس انسانی کو سب سے زیادہ اسی میں کشش محسوس ہوتی ہے۔ تاریخ انسانی اور علم نفسیات اس پر گواہ ہیں کہ خواہش انسانی کا یہ طاقتور داعیہ بڑے بڑے معرکے پیا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

عورتوں کے بعد بیٹوں کا ذکر کیا ہے۔ عورت کے بعد اولاد ہی انسان کی آرزوؤں اور توجہات کا مرکز ہوتی ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ انسان کو ازدواجی حیثیت میں عورت کی نزاکت و لطافت اور حسن آرائی میں رغبت ہوتی ہے تو اولاد میں اسے جو انردی، نومندی کا عنصر محبوب ہے جس کا مظہر بیٹا ہوتا ہے، بیٹیاں نہیں۔ اس لئے اس آیت میں بھی اور ایک دوسرے مقام پر بھی بیٹوں کو دنیا کی زندگی کی زینت قرار دیا ہے۔ ﴿الْمَالُ وَالْبَنُونَ زِينَةُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا﴾ (الکہف ۲۶:۱۸)

سونا چاندی پہلے آدوار میں خوش ذوقی اور شانِ امارت کے اظہار کا ذریعہ بھی تھا اور سکے کی صورت میں تبادلہ اشیاء کا آلہ بھی۔ آج بھی یہ اشیاء اسی طرح مرغوب ہیں صرف سکوں کی حیثیت اب کاغذی نوٹوں میں تبدیل ہو گئی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ پہلے پیسوں کی جھکار اور اشرافیوں کی کھنک انسان کو مرغوب تھی اور اب نوٹوں کی کتنی کی وقت ہاتھوں کے لمس میں انسان سرور محسوس کرتا ہے۔ اسی لئے انسان بار بار پیسوں کو گنتا ہے گویا:

﴿الَّذِي جَمَعَ مَالًا وَعَدَّدَهُ، يَحْسَبُ أَنَّ مَالَهُ أَخْلَدَهُ﴾ (الہزہ ۱۰۴:۲۰)

”اس نے مال جمع کیا اور گن کر رکھا۔ وہ سمجھتا ہے کہ اس کا مال ہمیشہ اس کے پاس رہے گا“

وہ کتنا بیوقوف اور حقیر ہے جس کی یہ صفت ہو۔ کیا وہ ان ہولناکیوں کو یاد نہیں کرتا جن کا اسے سامنا کرنا ہے؟ کیا وہ اپنے متعلق ڈرتا نہیں کہ اسے عذاب آنے سے پہلے نیک اعمال کر لینے چاہئیں، اس لئے کہ عمر بہت جلد گزر جائے گی اور موت اچانک آجائے گی۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿أَنْ تَقُولَ نَفْسٌ يَحْسَرْتُنِي عَلَى مَا فَرَّطْتُ فِي جَنْبِ اللَّهِ وَإِنْ كُنْتُ لَمِنَ السَّخِرِينَ﴾ (الزمر: ۵۶/۳۹) ”ایسا نہ ہو کہ کوئی نفس کہے: ہائے افسوس، میں نے اللہ کے بارے میں کوتاہی کی اور میں مذاق اڑاتا رہ گیا“

اللہ نے انسانی فائدے کے پیش نظر مال کے لئے فضل اور خیر کے الفاظ مثال کے طور پر استعمال فرمائے۔ اولاد کو اپنی نعمت قرار دیا لیکن انسان مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو جاتا ہے: ﴿وَتَحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا﴾ (الفجر: ۸۹:۲۰)

جبکہ اولاد کی محبت بھی اس کے لئے موجبِ فتنہ اور ذریعہ آزمائش بن جاتی ہے: ﴿وَاعْلَمُوا أَنَّمَا آمُوا لَكُمْ وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ﴾ (الانفال: ۸:۲۸)

بچپن میں اولاد کی بھولی بھالی صورتیں اور چھوٹی چھوٹی حرکتیں اور جوانی میں ان کی تنومندی اور ان کے مستقبل کی فکر انسان کو خدا کی یاد سے غافل کر دیتی ہے۔ اسی لئے اللہ نے اپنے بندوں کو اس بارے میں خبردار کیا ہے کہ: ﴿لَا تُلْهِكُمْ أَمْوَالُكُمْ وَلَا أَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ (المنافقون: ۹:۶۳)

مال اور اولاد کی کثرت ایسی چیز ہے جو انسان کو خدا کے مقابلے میں سرکشی و تمرد پر آمادہ اور عذابِ خداوندی سے بے پرواہ کر دیتی ہے:

﴿وَقَالُوا نَحْنُ أَكْثَرُ أَمْوَالًا وَأَوْلَادًا وَمَا نَحْنُ بِمُعَذِّبِينَ﴾ ”کھاتے پیتے لوگوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ مال اولاد رکھتے ہیں اور ہم ہرگز سزا پانے والے نہیں ہیں“ (سبا: ۳۳:۳۵)

گھوڑے اس دور میں سواری کے لئے استعمال ہوتے تھے اور قوت و ہیبت کا ذریعہ بھی تھے، گویا آج اچھی گاڑیاں اور اسلحہ اس کے متبادل ہیں۔ اس کے علاوہ موسیقیوں کی فریبی اور بھین اور فصلوں و کھیتوں کا جو بن انسان کے لئے فراخیِ رزق کے ساتھ ساتھ زینت و خوشنمائی کا ذریعہ بھی ہے۔

مذکورہ بالا تمام طبعی کمزوریاں ہی درحقیقت انسان کے تحفظِ ذات، مستقبل کی تیاری، مالی کفایت شعاری، خلافت فی الارض اور بقائے نسل کی جدوجہد کا ذریعہ ہیں۔ اب اگر محض عقل اور علم انسانی پر ہی حیات و معیشت کا انحصار قرار دیا جائے تو اس کے الحاد سرکشی کا وہ عالم ہوگا جس کا نظارہ آج ہم یورپ و امریکہ کی تہذیب و معاشرت اور سیاست و معیشت میں کر رہے ہیں کہ وہ انسان جسے ’حسنِ تقویم‘ میں تخلیق کیا گیا تھا، آج ﴿ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ﴾ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ البتہ اگر وحی و الہام کی آبیاری، بارگاہِ اقدس کی مہربانیاں اور ایمان و عمل صالح کی فضا اس کی سازگاری کرے تو وہ اپنی طبعی کمزوریوں کے باوجود ﴿إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ﴾ کے زمرے

پندرہویں صفت..... گھٹا و خسارہ

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَالْعَصْرِ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ ، إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَّصُوا بِالْحَقِّ وَتَوَّصُوا بِالصَّبْرِ﴾ (العصر: ۱-۳)

”زمانے کے قسم! یقیناً انسان گھٹے میں ہے مگر جو ایمان لائے اور نیک عمل کئے اور آپس میں سچائی کی تلقین کی اور صبر کی تلقین کی“

بے شک اس زندگی میں ایک راستے کے سوا کوئی سیدھا راستہ نہیں ہے۔ اس کے سوا گمراہی اور خسارہ ہی خسارہ ہے لہذا اس سورۃ میں انسان کے تمام مفید اوصاف یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ اسی لئے امام شافعیؒ کا قول ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان کے لئے صرف یہی سورۃ اُتارتا تو کافی ہوتی۔

یقیناً انسان کا اصل اور عام گھٹا، گمراہی اور ہلاکت ہے لیکن جس میں یہ چار اوصاف پائے جائیں وہ اس خسارے سے محفوظ رہتا ہے: (۱) ایمان (۲) نیک اعمال (۳) سچائی کی تلقین (۴) صبر کی تلقین کیونکہ ایمان زبان سے اقرار کرنے، اعضاء سے عمل کرنے اور دل سے عقیدہ رکھنے کا نام ہے۔ ایمان اطاعت سے بڑھتا اور نافرمانی سے کم ہوتا ہے۔ علماء اہل سنت والجماعت کے نزدیک ایمان کی یہی تعریف ہے۔ اور ایمان وہ اصل ہے جس سے خیر کی تمام شاخیں پھوٹی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿ضَرَبَ اللَّهُ مَثَلًا كَلِمَةً طَيِّبَةً كَشَجَرَةٍ طَيِّبَةٍ أَصْلُهَا ثَابِتٌ وَفَرْعُهَا فِي السَّمَاءِ تُؤْتِي أَكْثَرًا كُلِّ شَيْءٍ بِإِذْنِ رَبِّهَا وَيَضْرِبُ اللَّهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ﴾

”اللہ نے کلمہ طیبہ کی مثال ایک پاکیزہ درخت سے دی ہے، جس کی جڑ ثابت و پائیدار ہے اور شاخ

میں شامل ہو سکتا ہے۔

تمام تر کمزوریوں کے باوجود انسان کی فطرت ابتدا میں صالح اور نیک رکھی گئی ہے۔ طرح طرح کی آلائشیں ہیں۔ انسان کی ہر طرح کی فطری کمزوریاں قابلِ تعمیر ہیں یا نہیں، اس بارے میں سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

”جس بات کو ہم اپنی زبان میں یوں کہتے ہیں کہ ”یہ بات انسان کی سرشت میں ہے“ یا ”یہ انسان کی فطری کمزوری ہے“..... اس کو اللہ تعالیٰ اس طرح بیان فرماتا ہے کہ انسان ایسا پیدا کیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ بات نگاہ میں رہنی چاہئے کہ قرآن مجید میں بکثرت مواقع پر نوعِ انسانی کی عام اخلاقی کمزوریوں کا ذکر کرنے کے بعد ایمان لانے والے اور راہِ راست اختیار کر لینے والے لوگوں کو اس سے مستثنیٰ قرار دیا گیا ہے..... اس سے یہ حقیقت خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہ پیدائشی کمزوریاں ناقابلِ تغیر و تبدل نہیں ہیں بلکہ انسان اگر خدا کی بھیجی ہوئی ہدایت کو قبول کر کے اپنے نفس کی اصلاح کے لئے عملاً کوشش کرے تو وہ ان کو دور کر سکتا ہے اور اگر وہ نفس کی باگیں ڈھکی چھوڑ دے تو یہ اس کے اندر راسخ ہو جاتی ہیں“ (تفہیم القرآن: ج ۶، ص ۹۰، ۸۹)

آسمان میں ہے جو اپنا پھل اللہ کے حکم سے ہر وقت دیتا ہے اور اللہ لوگوں کے لئے مثالیں بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں“ (ابراہیم: ۲۴/۲۵)

اور کفر ایک ایسی بنیاد ہے جس سے ہر برائی پیدا ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللّٰهِ فَكَأَنَّمَا خَرَّ مِنَ السَّمَاءِ فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ أَوْ تَهْوِي بِهِ الرِّيحُ فِي مَكَانٍ سَحِيقٍ﴾ (الحج: ۳۱/۳۲) ”اور جو اللہ کے ساتھ شرک کرتا ہے گویا وہ آسمان سے گر گیا اور اسے پرندے اچک رہے ہیں یا ہوا اسے دور دراز جگہ میں ڈال رہی ہو“

اللہ تعالیٰ مزید فرماتا ہے:

﴿وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَلَأَهَا مِنْ قَرَارٍ﴾

”اور برے کلمے کی مثال خبیث درخت کی ہے جو زمین کے اوپر سے اکھاڑ دیا گیا ہو اور اسے کوئی قرار و ثبات نہ ہو“ (ابراہیم: ۲۶/۱۴)

انسان کا ایمان جب تک نیک عمل سے وابستہ نہ ہو یہ اس کے لئے کافی نہیں ہوتا۔ اس پر بس نہیں، بلکہ جو بات دل میں ہو، عمل اس کی تصدیق کرے اور وہ صبر کے ساتھ اس کی دعوت بھی دیتا ہو۔ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا ضروری ہے کیونکہ یہی محمد ﷺ کے پیروکاروں کا طریقہ ہے:

﴿قُلْ هَذِهِ سَبِيلِي أَدْعُو إِلَى اللَّهِ عَلَى بَصِيرَةٍ أَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِي﴾ (یوسف: ۱۰۸/۱۲)

”آپ فرمادیں کہ یہی میرا راستہ ہے کہ میں اور میرے پیروکار بصیرت کے ساتھ اللہ کی طرف دعوت دیتے ہیں“

اور دعوت الی اللہ اور سچائی کی تلقین کئے بغیر نہ فرد کی کامیابی ہے اور نہ جماعت کی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ﴾ (آل عمران: ۱۱۰/۳)

”تم بہترین امت ہو، لوگوں کے لئے پیدا کئے گئے ہو، نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو“

جب کوئی شخص نیکی کا حکم دینے اور برائی سے روکنے کے لئے تیار ہوتا ہے تو اس کا ٹکراؤ لازماً ایسے لوگوں سے ہوتا ہے جو اس کی راہ میں حائل ہوتے اور اسے تکلیف پہنچاتے ہیں۔ اسی لئے جو لوگ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کرتے ہیں، ان کے لئے صبر کرنا اور اپنے ساتھیوں کو اس کی تلقین کرنا ضروری ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت لقمان کی حکایت بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿يَبْنَئِي أَقِمِ الصَّلَاةَ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأَصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ إِنَّ ذَلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ﴾ (لقمان: ۱۷/۳۱)

”اے میرے بیٹے! نماز قائم کرو اور نیکی کا حکم دو اور برائی سے روکو اور جو تکلیف پہنچے، اس پر صبر کرو بے شک یہ عزیمت اور حوصلے کی بات ہے“ ☆☆

جامعہ لاہور الاسلامیہ کی علمی سرگرمیاں

جامعہ لاہور الاسلامیہ (جامعہ رحمانیہ) ایک تحریک ایک فکر کا نام ہے۔ جس کے بنیادی مقاصد میں سے ایک اہم مقصد یہ ہے کہ اسلام کو موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق عملی صورت میں پیش کیا جائے۔ جس کے لئے ایک وسیع و عریض علماء کے نیٹ ورک کی ضرورت ہے۔ جو اسلامی نظام کو عمل کے پیراہن سے آراہستہ کرنے کی صلاحیت کے حامل ہوں۔ جو یہ بات ثابت کر سکیں کہ اسلام کا مذہبی، معاشی، معاشرتی، تمدنی، ثقافتی اور اخلاقی نظام کسی بھی دوسرے نظام کے اختلاط کے بغیر ایک کامل و اکمل حیثیت رکھتا ہے۔ اسلام کو کسی بھی شعبہ ہائے زندگی میں غیروں کی محتاجی کا سامنا نہیں ہے۔ جامعہ لاہور الاسلامیہ کچھ اس قسم کے علماء کی تیاری چاہتا ہے جو خدمت دین کے نام پر امت کی سوچوں کو منتشر کرنے کی بجائے خالصتاً اسلام کے نقطہ پر مرکوز کریں۔ تاکہ ان کا ایک محور پر ارتکاز سر اٹھاتے فتنوں کو کچھ کر رکھ دے۔ جامعہ اپنے اس مقصد کے حصول کے لئے گا ہے بگا ہے پروگرام مرتب کرتا رہتا ہے کہ اپنے ان محدود دستیاب وسائل کے اندر رہتے ہوئے کلمۃ اللہ علیہا کی خاطر کچھ کر گزریں۔ ماضی قریب میں شروع ہونے والے کچھ پروگرام حسب ذیل ہیں:

۱۔ **مختصین کی کلاس کا اجراء:** جون، جولائی کے مہینوں میں جامعہ میں دورہ تدریسیہ کا اہتمام ہوا تھا۔ جس میں مستقبل کے لئے اس عزم کا اظہار کیا گیا تھا کہ علماء کرام کو تخصص کے درجے کی تعلیم دینے کے لئے ایک سالہ کلاس شروع کی جائے گی اور یہ دورہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے۔ اس سلسلے کی دوسری کڑی کے طور پر ۹۹۔ جے ماڈل ٹاؤن میں اگست کے مہینے سے تخصص کی کلاس شروع ہو چکی ہے۔

یہ کلاس حافظ عبدالرحمن مدنی صاحب لے رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اب تک ڈاکٹر خادم حسین سہیل صاحب استاذ جامعہ ام القریٰ مکتہ المکرمہ سعودی عرب، محترم ڈاکٹر اکرم چوہدری صاحب پنجاب یونیورسٹی، مولانا رمضان سلفی صاحب، شیخ آصف افغانی صاحب اور مولانا عبدالوحید روپڑی صاحب متعدد لیکچر دے چکے ہیں۔ ان کے علاوہ کلاس کی نگرانی کرنے والوں میں قاری ابراہیم صاحب میر محمدی، عطاء اللہ صدیقی صاحب اور حافظ حسن مدنی صاحب کے نام شامل ہیں۔ اب تک ہونے والے لیکچروں میں، قرآن کی حقیقت، تفسیر کے سنی اور بدعی طریقے، شریعت میں عقل کا مقام نعت کی حیثیت، حجیت حدیث، قرآن و سنت کے معاون علوم، فتنہ انکار حدیث، عقل پرستی کا فساد، اسلام میں اختلاف کی ابتداء، فتنہ خوارج و معتزلہ کی حقیقت، ہندوستان میں علمی ارتقاء وغیرہ کے موضوعات خاص طور پر خصوصیت کے حامل تھے۔ علمی نرسری کی آبیاری کا یہ سلسلہ ہنوز جاری و ساری ہے۔

تحریری صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لئے لیکچروں سے ہٹ کر پروگرام تشکیل دیا گیا ہے۔ جس کے ابتدائی مرحلے کے طور پر تمام طلباء کو رسائل مہیا کئے گئے ہیں تاکہ وہ ان رسائل کی بنظر عمیق مطالعہ کر کے

اس کے خلاصے کو احاطہ تحریر میں لائیں۔ اس ابتدائی مشق کے بعد بڑی کتابوں سے استفادہ کرنے کی بہتر صلاحیت پیدا ہوگی۔ یہ کام عطاء اللہ صدیقی صاحب اور قاری محمد ابراہیم میر محمدی صاحب کی نگرانی میں ہو رہا ہے۔ امید ہے وقت کے ساتھ ساتھ اس کلاس میں مزید بہتری پیدا ہوگی۔

کمپیوٹر کلاس: دور حاضر میں عصری تقاضوں سے انحراف کوئی قابل قدر بات نہیں ہے۔ اس وقت کمپیوٹر اپنی اہمیت تسلیم کروا چکا ہے اور دنیا کے ہر شعبہ میں چھاتا چلا جا رہا ہے۔ ان حالات میں دینی ادارے اس سے استغنا نہیں برت سکتے اور لامحالہ طور پر دینی میدان میں بھی اس کے اثرات واضح ہیں۔ جامعہ نے اپنے طلباء کے لئے کمپیوٹر کی تعلیم کا اہتمام کیا ہے اور اب تو محدث بھی انٹرنیٹ پر آچکا ہے۔ ہر سال کی طرح اس سال بھی کمپیوٹر کی کلاس کا آغاز ہو چکا ہے جس میں جامعہ کے طلباء زیر تعلیم ہیں۔

شعبہ عصری علوم: جامعہ لاہور الاسلامیہ خالصتاً ایک دینی ادارہ ہے۔ جو دینی علوم کی تعلیم و ترویج کے لئے مختص ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے طلباء اور علماء کو معاشرے کا فعال رکن بنانے کے لئے عصری علوم کا بھی اہتمام کیا گیا ہے۔ تاکہ حاملین علم نبوت کے ذہنوں میں کسی طرح کا احساس کمتری پیدا نہ ہو اور ربطاتی نظام تعلیم کی تقسیم کی بدولت علم کے کسی بھی میدان میں کسی سے بھی پیچھے نہ رہیں۔ جامعہ میں کلاس ششم سے لے کر بی۔ اے تک کی تعلیم کا باقاعدہ انتظام موجود ہے۔ جس کے تحت طلباء ہر سال بورڈ اور ریونیورسٹی کے امتحان میں شریک ہوتے ہیں اور ممتاز نمبروں سے کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

۲۹۔ اگست ۲۰۰۱ء کو بی۔ اے ۲۰۰۱ء کے رزلٹ کا اعلان ہوا۔ اس سال جامعہ کے دس طلبہ نے اس میں حصہ لیا۔ اور نہایت مسرت کی بات ہے کہ آٹھ طلباء اس امتحان میں کامیاب ہوئے اور دو طلبہ کی ایک مضمون میں کمپارٹ ہے۔ اس طرح جامعہ کے طلباء کی کامیابی کا تناسب ۸۰ فیصد رہا۔ ان میں سے ۵۰ فیصد نے فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ کامیابی کا یہ تناسب کم ہی اداروں کو حاصل ہوا ہوگا۔ بلکہ ۱۳ کالج ایسے ہیں جن کا رزلٹ صفر رہا۔ ایسے میں ایک دینی ادارے کا عصر علوم میں اتنا اچھا رزلٹ یقیناً ایک خوش آئند بات ہے اور جامعہ کے طلباء اور اساتذہ کی محنت کا عکاس ہے۔ کامیاب ہونے والے طلباء کا رزلٹ حسب ذیل ہے:

نام	رول نمبر	حاصل کردہ نمبر
محمد اکرم شاہد	۴۷۳۳۶	۵۴۸
سیف اللہ	۴۷۳۴۱	۵۴۸
طیب نذیر	۴۸۱۴۴	۵۲۶
حماد فاروق	۴۴۵۲۹	۴۸۷
مرزا عمران حیدر	۴۶۵۵۸	۴۷۷
حافظ محمد اکرم	۴۷۳۳۹	۴۷۰
عبدالرحمن عابد	۴۸۱۴۸	۴۶۵
کلیم اللہ	۴۸۱۴۰	۴۵۹

MONTHLY

MUIHADDIS

LAHORE

- عناد اور تعصب قوم کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں..... لیکن تعصبات سے بالاتر رہ کر افہام و تفہیم اُمت کے لیے رحمت کا باعث ہے۔
- علوم جدیدہ سے ناواقفیت اور انکار، انسانی ارتقاء کو تسلیم کرنے میں بخل کا درجہ رکھتے ہیں..... لیکن قدیم علوم اسلامیہ کو فرسودہ قرار دینا اور مذہبی روایات کے حاملین کو دُقیانوس بتانا اُمت کی تباہی کا سبب ہے۔
- غیر مذاہب کے بارے میں معاندانہ رویہ اختیار کرنا اسلامی اقدار کے منافی ہے..... لیکن دین اسلام پر غیر مذاہب کے حملوں کا دفاع نہ کرنا اور اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام نہ دینا حمیت دینی اور غیرتِ اسلامی سے یکسر انحراف ہے۔
- تبلیغِ دین اور اشاعتِ اسلام میں حکمتِ عملی کو نظر انداز کر دینا مصالحِ دینیہ کے خلاف ہے لیکن حلال اور حرام کے امتیاز میں رواداری برتنا اور قوانین و مسائلِ اسلامیہ کو نرم کر دینا اسلامی روح کو کمزور کر دینے کے مترادف ہے۔
- آئین و سیاست سے بیگانہ ہو کر عبادت کے لیے گوشہ نشین ہو جانا زندگی سے فرار ہے..... لیکن جدا ہو دین سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی
- جاہل کو دور ہی سے سلام کر دینا عبادِ صالحین کے اوصاف میں داخل ہے..... لیکن جاہلیت کو مٹانا اور باطل کا تعاقب کرنا عین جہاد ہے۔



..... اگر آپ ایسا مصنف اور مستند رویہ پسند کرتے ہیں تو

مِلّٰت

کا مطالعہ فرمائیے، آپ اس کو ان جملہ صفات و محاسن سے مزین پائیں گے، اِنْ شَاءَ اللہ!
کیونکہ اس کے مضامین اسی مخصوص طرزِ فکر کے حامل ہوتے ہیں۔

زیر سالانہ: ۲۰۰ روپے

فی شمارہ: ۲۰ روپے

ISLAMIC RESEARCH COUNCIL

99-J, Model Town, Lahore-54700. Phones: 5866476, 5866396